مقاماتِ وارث شاہ

علی عبّاس جلالپوری

فہرست

1 پیش لفظ

2 عشق و فسانۂ عشق

3 ہیر وارث شاہ کے کردار

4 زبان و بیان

5 وارث شاہ کا علم و فضل

6 دیس پنجاب کی تصویر کشی

7 طنز و مزاح

8 وارث شاہ کا سماجی شعور

9 ہیر وارث شاہ پر اعتراضات

10 مقاماتِ وارث شاہ

پیش لفظ

جب سے میرا شعور بیدار ہوا لوک گیتوں کا رس میرے کانوں میں گھلتا اور میرے من میں رچتا رہا۔ میرا لڑکپن جہلم اور گجرات کے دیہات میں گذرا تھا میرے ننھیال کی حویلی کے سامنے ایک چھتنار درخت تھا۔ دوپہر کے وقت تیز دھوپ سے بچنے کے لئے کبھی کبھار جاٹ اس کے سائے میں پناہ لیتے اور گا بجا کر دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک گبھرو جوڑی بجانے لگتا، دوسرا چمٹے کی تال دیتا اور تیسرا لہک لہک کر گانے لگتا ؎

چو چک دے گھر ہیر سٹیڈی اُس دا میں دنجا را

ادسئے اُسدا میں دنجارا

جوڑی کی دُھن سارنگی کے لہرے کی طرح یک آہنگ ہوتی ہے اور معمولی سے تغیّر کے ساتھ بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اِسے سُن کر نوجوان جاٹ مست و بے خود ہو جاتے ان کے دھوپ میں سنولائے ہوئے چہروں کا تانبا پگھل جاتا، ہونٹوں پر مسکراہٹ جم کر رہ جاتی۔ آنکھیں خود سپردگی سے نیم وا ہو جاتیں اور گال ہیجانِ آرزو سے تمتمانے لگتے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا کہ جوڑی بجانے والا جوش میں آ کر بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوتا اور جوڑی بجاتے ہوئے مست ناگ کی طرح دائیں بائیں جھومنے لگتا۔ یہ دیکھ کر چمٹے والا بھی تڑپ کر کھڑا ہو جاتا اور اچھل اچھل کر زور زور سے چمٹا بجانے لگتا۔ جوان لہو میں آگ لگ جاتی اور

جیو! جیو!! بچے! بچے!!

کی آوازوں سے فضا گونج اٹھتی۔ کبھی کبھی ساون کی راتوں کو 'بہک' میں ماہیے کی محفل جمتی اور گبھرو باری باری ماہیے کے بول گایا کرتے تھے۔ زمانہ گذرتا گیا۔ مجھے حصولِ تعلیم کے لئے اور پھر ملازمت کے چکروں میں شہروں کا رُخ کرنا پڑا اور دیہات میں گذارا ہوا وقت خواب و خیال ہو گیا۔ اس دوران میں گاؤں جانے کا اتفاق ضرور ہوتا رہا لیکن جم کر رہنے کا موقع نہ مل سکا۔ شوقِ مطالعہ مجھے محکمۂ تعلیم میں لے گیا تھا۔ میں ربع صدی تک ادبیاتِ عالم کا مطالعہ کرتا رہا لیکن بدقسمتی سے پنجابی شاعری کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ مرزا صاحباں، کافیاں خواجہ غلام فرید اور ہیر وارث شاہ سُن سُن کر البتہ حظ اندوز ہوتا رہا۔ ۱۹۶۷ء میں میرا تبادلہ لاہور میں ہوا تو میں نے دیکھا کہ شہر میں ہر کہیں پنجابی ادب و شعر کا چرچا ہے اور پنجاب کے ادیب اپنی مادری زبان کی عظمت کو بحال کرنے میں کوشاں ہیں۔ اُن کی باتیں سُن کر مجھے پنجابی ادب و شعر کے باقاعدہ مطالعے کی تحریک ہوئی۔ اس مطالعے کا آغاز میں نے ہیر وارث شاہ سے کیا جسے پڑھ کر میری مسرت آمیز حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور مجھ پر اس خوش آئند حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ہیر وارث شاہ ذوقی حظوظ و مزایا کا ایک انمول خزانہ ہے۔ تین برس ہیر کا ورد کرنے میں کٹ گئے اور بالآخر میں نے ارادہ کیا کہ اس شاہ کار پر ایک مقالہ لکھوں۔ یہی مقالہ پھیل کر 'مقاماتِ وارث شاہ' کی صورت اختیار کر گیا۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ یہ کتاب پنجابی میں لکھی جائے۔ یہ رائے اپنی جگہ درست تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ اردو والے بھی 'ہیر' سے بہرہ اندوز ہوں۔ پنجابی تو سبھی اردو جانتے ہیں، اُن کے لئے کچھ فرق نہیں پڑے گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اسے پنجابی میں بھی منتقل کر دوں گا۔ اس کتاب کے دورانِ تالیف میں 'ہیر' کے متعدد نسخے میرے پیشِ نظر رہے۔ بعض ہیر شناسوں نے 'ہیر' کے بڑے بڑے خوبصورت بند الحاقی قرار دے دیئے ہیں۔ میں اصل و الحاق کے چکر میں پڑ جاتا تو شاید اس تالیف

ہی سے دہشت کش ہو جاتا۔ اِس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک عظیم شاعر کے کلام میں اِس طرح اِلحاق کرنا کہ اِلحاق پر اصل کا شبہ ہونے لگے از قبیل محال ہے۔ ریشم کے ساتھ ٹاٹ کا پیوند بے شک لگایا جا سکتا ہے لیکن اس ٹاٹ کو ریشم کر دکھانا تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے اِلحاقی اشعار کے وجود سے انکار نہیں ہے۔ لیکن اِس نوع کے اشعار بہت کم ہیں۔ 'ہیر' کے ایسے دلآویز بند کیسے اِلحاقی ہو سکتے ہیں جو پکار پکار کر وارث شاہ کی بے مثل قدرتِ بیان، تخلیقی شورش اور خلوصِ جذبہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ انہیں اِلحاقی قرار دینا گویا دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں کو وارث شاہ کا ہمسر اور ہم پلّہ تسلیم کرنا ہے۔ لہٰذا میرے ذوق نے اجازت نہیں دی کہ میں اِن بلند پایہ مقامات کو اِلحاقی سمجھ کر ان سے صرفِ نظر کر لوں۔ 'ہیر' میں کہیں کہیں اُکھڑے اُکھڑے خارج از بحر اشعار بھی ملتے ہیں۔ اِلحاق اگر ہُوا ہے تو انہی اشعار کا ہُوا ہے۔

'مقاماتِ وارث شاہ' کے لکھنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ 'ہیر' کے مطالعے سے جو مسرت بے پایاں مجھے ارزانی ہوئی اس میں دوسروں کو بھی شریک کروں اور وارث شاہ کی شاعرانہ عظمت جس انداز میں مجھ پر منکشف ہوئی اس کا احساس دوسروں کو بھی دلاؤں۔ مَیں نے 'ہیر وارث شاہ' کا مطالعہ عالمی ادب و شعر کے پس منظر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس بات کا فیصلہ قارئینِ کرام ہی کر سکیں گے کہ اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

علی عبّاس جلالپوری

لاہور،

۱۴ر جنوری ۱۹۷۲ء

عشق و فسانۂ عشق

ہیر رانجھا کی کہانی ایک ولولہ انگیز عشقیہ داستان ہے جو صدیوں سے دیس پنجاب میں مقبول تھی۔ وارث شاہ نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر اسے شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ارادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ میں عشق و محبت کے اس قصے کو دلکش پیرائے میں لکھوں گا۔ عالم بے بقا کے لالچ کو بالائے طاق رکھ کر فنا کا درجہ حاصل کروں گا۔ میرے پاس عشق کے اسرار و رموز کی جو دولت ہے اُسے کھلے بندوں لُٹا دوں گا اور خسیسوں کی طرح سینت سینت کر نہیں رکھوں گا۔ میں کوّے کی طرح منڈیر پر بیٹھ کر اپنی کائیں کائیں سے لوگوں کا مغز نہیں کھپاؤں گا بلکہ بلبل کی مانند زمزمہ کروں گا۔ اس میں خواص و عوام دونوں کی دلچسپی کا سامان ہوگا اور رمز و کنایہ کے رنگ میں عشق کی خوشبو چاروں طرف پھیلاؤں گا۔ لوگ ہیر رانجھا کی عشقیہ داستان بھول چکے ہیں۔ میں نئے سرے سے اس میں روح پھونک دوں گا۔ وارث شاہ! آؤ دوستوں کے ساتھ مل کر عشق و عاشقی کا ذکر چھیڑیں ؎

یاراں آساں نوں آن سوال کیتا قصہ ہیر دا نواں بنائیے جی

اس پریم دی جھوک دا سب قصہ سوہنی جیبھ دے نال سنائیے جی

حرص توڑ کے بود نابود والی درجے خاص فناہ وچ پائیے جی

نپٹے دوستاں ہون تے ونڈ دیئے گندھی چھوڑیاں ناں سدائیے جی

بُلبل ہو کے چہکنے باغ اندر سخن رمز دے نال الایئے جی

کاواں وانگ اُڈّار بنیریاں دے ایویں گوڑ نہ مغز کھپایئے جی

لشکدار رنگیلڑا شعر کر کے خاص عام دا چیت بھرمایئے جی

رمزاں معنیاں وچہ خوشبو ہووے عشق مُشک نوں کھول دکھایئے جی

رانجھے ہیر دے عشق دی گل سُچی نویں سرے توں پھیر جگایئے جی

وارث شاہ پیاریاں نال رَل کے ہُن عشق دی بات ہلایئے جی

وارث شاہ خُود بھی عشق کے درد آشنا تھے۔ ہجر کی سوزناکی اور وصال کی از خود رفتگی کا کوئی پہلو اُن سے مخفی نہیں تھا۔ اُن کی محبوبہ بھاگ بھری موضع مدسی کی رہنے والی تھی۔ وارث شاہ پاکپتن سے واپس آتے ہوئے مدسی میں شب باش ہوئے۔ بھاگ بھری کے گھر رات کا کھانا کھانے گئے تو اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے اور مدسی کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیئے۔ بھاگ بھری بھی ان سے محبت کرنے لگی۔ محبت کا راز فاش ہوا لیکن وارث شاہ اور بھاگ بھری کا پیار بے لوث اور ہوا و ہوس سے پاک تھا اس لئے کسی نے تعرض نہ کیا۔ وارث شاہ کو عشقِ مجازی کی منازل طے کرتے کچھ زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ بھاگ بھری اچانک انہیں داغِ مفارقت دے گئی۔ وارث شاہ کو اس کی مرگِ ناگہاں کا سخت صدمہ ہوا۔ غمِ فراق اور حسرتِ دید کے اسی عالم میں ہیر کا قصہ نظم کرنا شروع کیا۔ کتاب کے خاتمے پر کہتے ہیں ؎

جدوں ہوئی تیار ایہ خبر سیتی واہ واہ سب خلق پکار دی سی

وارث شاہ دی غرض سب پُجّ گئی پوری جیہنوں ڈُھنڈ توں سِک دیدار دی سی

"ہیر" میں جا بجا اپنے عشق اور محرومی کا ذکر کرتے ہیں ؎

وارث شاہ نوں سِک دیدار دی سی جیہی ہیر نوں بھٹکنا یار دی سی

زلیخا وانگ جیکر ثابت قدم رہیوں تدوں جان لئیاں درشن یار کیتے

ایس عشق دے نشے نے نڈھیئے نیں وارث شاہ ہوری پریشان کیتے

وارث شاہ نوں شوق لقا دائی جیویں ہیر نوں یار دی چاہ مائی

ایس زلف زنجیر محبوب دی نے وارث شاہ ہوری مجذوب کیتے

وارث شاہ ایک صاحب حال صوفی تھے۔ اسی عشقِ مجازی نے اُن پر عشقِ حقیقی کا راز کھولا تھا ؎

وارث شاہ حقیقی دی نہیں لذت پہلاں چکھدے لُون مجازیاں دا

وارث شاہ کی دردمندی اور سوزِ قلب نے "ہیر" کے اشعار کو وہ بے پناہ تاثیر عطا کی کر انھیں سُن کر اہلِ دل وجد کرنے لگتے ہیں اور عُشاق کے چہرے ہیجانِ آرزو سے تمتمانے لگتے ہیں

وارث شاہ کا نظریۂ عشق یہ ہے کہ صبحِ ازل کو ارواح نے قالو بلیٰ کہہ کر جو پیمانِ وفا باندھا تھا تمام عشاقِ صادق اسی میثاق کے پابند ہیں۔ عشق و محبت کوئی اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ نوشتہ تقدیر ہے۔ عشق ہی کائنات کی تکوین اور تخلیقِ آدم کا سبب ہے۔ زُہد و ریاضت بھی عشق کے بغیر سعیٔ بے ثمر ہے۔ عشق کے بغیر شرحِ صدر کا حصول ممکن نہیں ہے۔ شیخ محی الدین ابنِ عربی کی طرح وارث شاہ کا بھی عقیدہ ہے کہ عاشقِ صادق کی موت شہید کی موت ہے۔ ؎

ایس عشق تھیں دھرت اکاس بنیا مخلوقات دا عشق اصول میاں
آدم زاد اس عشق دے کارنے جی ہویا آپ ظلوم جھول میاں
درجے پائے شہادتی عاشقاں نے تیغ عشق تھیں ہوئے مقتول میاں
پیاری جان دی ناہ پرواکیتی تاہیں رب دے ہوئے مقبول میاں
بھاویں لکھ ریاضتاں زُہد ہووے باجھ عشق نہ کجھ وصول میاں
جان دے کے عاشقاں پا لیا جانی یار نوں حسب معمول میاں
کھِلے تنہاں دے باغ قلوب اندر جنہاں کیتا اے عشق قبول میاں
وارث عاشقاں تے کرم ربدا اے جنہاں جانیا عشق معقول میاں

وجود کے اتھاہ تاریک غبار میں عشق شمع کا کام دیتا ہے۔ ؎

ایس اندھ غبار وجود اندر شمع عشق دی چا ٹمکاونے ہاں

عُشاق جان و مال لُٹا کر دیدارِ محبوب سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کا جوہر عشق ہی سے نکھرتا ہے۔ جیسے آگ میں تپ کر اصیل تلوار کا جوہر ظاہر ہوتا ہے۔ ؎

دولت مال گوا سر دکھ کر کے دیدباز دیدار ایہ یار دے نے

وارث شاہ جاں ذوق دی لگے کُنڈی جوہر نکلن اصیل تلوار دے نے

وارث شاہ نے ایک طرف تو صُوفیۂ وجُودیہ کی طرح عشقِ حقیقی کے ماورائی تصور کی ترجمانی مجاز کے رنگ میں کی ہے اور دوسری طرف مجازی عشق کے جواز میں یوم میثاق اور نوشتۂ تقدیر کا سہارا لیا ہے۔ مِٹھی نائن کی زبانی کہتے ہیں ؎

تینوں دَساں کی عشق میں رانجھیا دے اہناں نہیں محتاج نظیر دائی

عشق ہیرہے گا قدرت رب دی دا شیشہ عشق نما جنیر دائی

عشق وچہ بڑیاں تلک بازیاں نے ایتھے حوصلہ پست ضمیر دائی

عشق عاقلاں دی مت مار دیندا لکھے حکم ایہہ خاص تقدیر دائی

ہیر کہتی ہے ؎

عین شین تے قاف جے نیت میری جنہاں ہیر ایمان دیوایائی

قالو بلیٰ دے روز نکاح بدھا رُوح نبی نے آن سنجایائی

قطب ہو وکیل وچہ آن بیٹھا حکم رب نے آپ کرایائی

جبرائیل میکائیل گواہ چارے عزرائیل اسرافیل دی آیائی

ہیر کہتی ہے کہ میرا نکاح تو روزِ اول سے رانجھے کے ساتھ ہو چکا ہے اس لئے سیدے کھیڑے کے ساتھ میرا نکاح ناجائز ہے۔ عشق بادشاہ ہے شرع اس کی نائب ہے۔

مستاں کن مرد دُستان ایسا جیہا شرع تے عشق تمثیل یارو

شاہ عشق تے شرع وزیر اسدی جیوں کی تھانہ تے ضلع تحصیل یارو

ہیر قاضی سے طنزیہ کہتی ہے۔

ہیر آکھدی سنی میاں قاضیا وے کیوں چھیڑناایں شر شراریاں نوں
درس عشق دی واقفی نہیں تینوں پڑھ چھڈیو پا سپاریاں نوں

اہلِ ظاہر مقامِ عشق سے ناواقف ہوتے ہیں ؎

قاضی عشق دا حرف نہ اک پڑھیا صرف فقہ دا سبق پکایا ئی
موجب شرع دے فیصلہ اوس کیتا سچے عاشقاں پکڑ رڑھایا ئی

عشاق قیدِ شرع سے آزاد ہیں۔ ؎

چوری پڑھن نکاح تے زبردستی کدوں آکھیا حکم ایہہ ہادیاں نے
وارث عاشقاں نوں کون قید کردا جنہاں بخشیاں رب آزادیاں نے

جو لوگ عشاق پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں وہ جاہل اور منکری ہیں ؎

جاہل عاشقاں نوں ایویں دیہن طعنے جیویں کاب کملے لگے مگر ہڑاں
وارث شاہ اک ربدی مہر باجھوں ناہیں عاشقاں آسرا ہور کڑاں

عشق کی تاب ہر کوئی نہیں لا سکتا۔ جب تک عاشق کا سینہ چاک نہ ہو جائے وہ عشق کی آگ میں جل کر راکھ نہ ہو، وہ اپنی محبوبہ کے شمعِ رخسار کی تجلی سے محروم رہتا ہے۔

جدوں تیک توں عاقلا وانگ کنگھی چیرکے ہوندا دلوں فگار ناہیں
تدوں تیک محبوب دی زلف والی آوے نظر تینوں تار تار ناہیں
آتش عشق وچہ ساڑکے آپ تائیں جدوں تیک توں بنیں انگیار ناہیں
تدوں تیک اوہ شمع دیدار والی ہوئے نال ترے چشم چار ناہیں

عشق تلوار کی دھار، نیزے کی انی اور سانپ کی پھنکار سے زیادہ دہشت ناک ہے ؎

دہشت عشق دی بری اے تیغ کولوں برچھی سانگ تے سپ شوکیاڑ ائی

عشق کا داغ لوہے اور آم کے رس کے داغ کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ لگ جائے

تو چھپٹ نہیں سکتا۔ ہیر قاضی سے کہتی ہے ؎

شیشہ چیترے رہن نہ ماس باجھوں جھبٹ نال ایہہ رزق کماؤ میاں
داغ انب تے صار والے نائیں داغ عشق بھی رہے بیا میاں

عشق نوشتۂ تقدیر ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہیر کہتی ہے ؎

ہور سب گلاں منظور میتوں اک چاک توں نہ ہٹا میاں
جتھے قلم تقدیر دی چل چکی کون جتیا ویئے مٹا میاں

عشق ایک لا علاج مرض ہے۔ یہ کہتے ہوئے وارث شاہ کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے ؎

ایس عشق دے روگ دی گل ایہو ممکن ایس یقیں نہیں شفا میاں
وارث شاہ میاں جیویں گنج سردا حاذق آکھدے لا دوا میاں

دنیاداروں کے کام عقل و ہوش سے انجام پاتے ہیں۔ عاشق کا رجنوں سے غرض رکھتا ہے ؎

دنیاداراں دے کم سب عقل دے نے کم عاشقاں جھل دُتلیائی

ول ڈیورانٹ نے کہا ہے کہ ایک کمینہ شخص عشق اور فلسفے سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا۔
وارث شاہ رانجھے کی زبان سے کہتے ہیں ؎

بھائی عشق توں نس کے اوہ جاندے پُتر ہون جو کسے کنگالدے جی

عشق کے راز کو افشا کرنا آدابِ عاشقی کے منافی ہے ؎

رسم عشق دے پنتھ دی چپ رہنا مُونہوں بولیا جو سوئی ہاریائی
عاشق ہو جیس عشق اظہار کیتا گیا عاشقاں وچہ پھٹکاریائی

عشق کی راہ طویل اور کٹھن ہے عُشاق ہی شریعت کا اثبات بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بات فُقہا کے بس کی نہیں ہے۔ عشق مسلسل کاوش ہے۔ عُشاق کا مذہب راسخ ہے۔ حشر کے دن بھی وہ اپنے مسلک پر قائم رہیں گے۔ یہ لوگ نام و ننگ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ علم کے زور سے سورج کو مسخر کیا جا سکتا ہے لیکن عشق کے ناگ پر اس کا کوئی منتر کارگر نہیں ہو سکتا۔

ٹریاں سدِ سکندری ٹکھاندے نکلے عشق دا ناہ سبیل یارو
بناں عشق دا عاشقاں پاڑ دتا کر کے شروع دی نیک تفصیل یارو
درس عشق دا سدا ای رہے کھلا عاشق کدی نہ کرن تعطیل یارو
ایس عشق پچھے بنے چاک عاشق کیتی ذرا نہ شرم تے ڈھیل یارو
روز حشر بھی عشق دے وچہ اٹھن جدوں صور پھونکے اسرافیل یارو
وارث شاہ لکیا پنتھ عاشقاں دا قائم انہاں دی نیک دلیل یارو

حسین بے نیاز ہوتے ہیں اور عاشق جاں باز ۔

بے پرواہیاں بناں معشوق ناہیں سراں دتیاں باجھ دیدار ناہیں

عشق کے ناگ کے ڈسے ہوئے پر کوئی منتر کارگر نہیں ہو سکتا ۔

وارث شاہ اوتھے پھرے ناہیں منتر جنہاں عشق نے ڈنگیاں ماریاں نے

اپنے آپ کو فنا کر کے ہی محبوب کو پایا جا سکتا ہے ۔

وارث شاہ محبوب نوں تدوں پایئے کریئے دور جاں اپنا آپ میاں

عشق کا سودا سراسر گھاٹے کا سودا ہے ۔

وارث شاہ ایس عشق دے ونج وچوں کسے پلے نہ بدھی دمڑی اے

یہ ہے وہ عشق بلا خیز جس نے ایک لاڈلے نوجوان اور ایک الھڑ دوشیزہ کو طوفان برق باراں کی طرح اچانک اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جس کے باعث اُن کی زندگیاں مسکراہٹوں سے جگمگا اُٹھیں اور آنسوؤں سے بھیگ بھیگ گئیں۔ ہیر ایک شوخ اور کھلنڈری لڑکی تھی جسے اپنے حسن پر بڑا ناز تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ رانجھا ایک جوانِ رعنا تھا جو پیار کرنے والے باپ کی موت کے بعد بھائیوں کی بے مہری اور بھابیوں کی لعن طعن سے گھبرا کر اس حالت میں گھر سے نکل کھڑا ہوا کہ اس کی بغل میں ونجھلی تھی اور ہاتھ خالی تھا۔ رات ایک مسجد میں گذاری جہاں کے کٹھ ملا کے طعنوں سے اس کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ صبح سویرے پتن جا پہنچا اور ہیر کے پلنگ

پرلیٹ کر غافل سو گیا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا کہ ہیر اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی دریا کے
کنارے پر آ گئی اور اپنے پلنگ پر ایک اجنبی کو دراز دیکھ کر طیش میں آ گئی۔ وہ اسے مارنے کے
لئے لپک کر آگے بڑھی تھی کہ رانجھے نے آنکھیں کھول دیں۔ تقدیر اپنا کام کر گئی۔ دونوں ایک دوسرے
کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ وارث شاہ کہتے ہیں ؎

کجھ وِچ وجھلی کن وِچ والا زلف مکھڑے تے پریشان ہوئی
پھبتے وال چوٹی متھا چند رانجھا چشم کھلے وِچ غلطان ہوئی
صورت یوسف دی دیکھ طیموس بیٹی سنے مالکے بہت حیران ہوئی
نین مست کلیجڑے وِچ دھانے جویں تڑکڑی ترک سنان ہوئی
اوہنوں وہندیاں ہیر نوں خوشی ہوئی بار بار قربان ہوئی
روپ جٹ دا دیکھ کے جاگ لدھی ہیر وار گھتی سرگردان ہوئی
عشق حسن اسوار میدان چڑھ کے ہیم لٹ لئی پشیمان ہوئی
جھڑا زوری اپنے حسن والا سبھا چھڈ کے وِچ فرمان ہوئی
بھلا ہویا میں تینوں نہ مار بیٹھی کائی نہیں سی گل بے شان ہوئی
وارث شاہ نہ تھاؤں دم مارنے دی چار چشماں جدوں گھمسان ہوئی

ہیر رانجھے کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی جس طرح زلیخا حسنِ یوسف کے نظارے سے اپنے حواس کھو بیٹھی
تھی۔ وارث شاہ کہتے ہیں کہ چاہنے والوں کی آنکھیں چار ہوں تو وہاں دم مارنے کی کیا گنجائش
رہ جاتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے عشق طلوع ہوتا ہے اور عشاق کے دل و جان پر چھا جاتا ہے۔ اسے چار
چشموں کی گھمسان سے تعبیر کرنا نہایت بلیغ اندازِ بیان ہے۔ رانجھا بھی ہیر کے جمالِ جہاں سوز کی
تاب نہ لا سکا اور دادِ حسن دیتے ہوئے کہنے لگا ؎

مان متیئے روپ گمان بھریئے اٹھکھیلیئے رنگ رنگیلیئے نی
عاشق بھور فقیر تے ناگ کالے باجھ منتروں مول نہ کیلیئے نی

اسیں تُساں نوں ویکھ کے مست ہوئے تسیں ہو گئے وانگ تھیلے نی
ایہہ جوبنا ٹھگ بازار دائی ٹُرنے ہار ہے چھیل چھبیلے نی

رانجھے کے مُنہ سے اپنے حسن کی تعریف سُن کر اور اس کے بھولے بھالے چہرے کو دیکھ کر ہیر مست و بے خود ہو گئی اور بولی سے

صورت تُدھ دی بہت پسند آوے سانوں جیو دیوچہ توں بھاوندا ہیں
نین مست تے بھولڑا مکھ تیرا گلاں مٹھیاں نال ہساوندا ہیں

دیہاتیوں کے جذبات میں فطری شگفتگی ہوتی ہے اور وہ بناوٹ اور ساختگی سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ نہ اپنی نفرت کو چھپا سکتے ہیں اور نہ اپنی محبت پر پردے ڈال سکتے ہیں۔ ان کا پیار عشوہ وغمزہ ناز اور نخرے سے بے نیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ رانجھے اور ہیر نے بے محابا ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا اور عشق کی قہرسامانیوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ہیر رانجھے کو لے کر اپنے باپ کے پاس گئی اور اسے کہہ سُن کر اپنے یہاں "چاک" رکھوا دیا۔ رانجھے نے مزید اطمینان کے لئے ہیر سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں مجھے بھول جاؤ گی۔ مجھے روٹی کے ٹکڑے پر ٹرخاتی رہو گی اور میرا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوگا۔ مجھ سے نبھانے کا پکا عہد و پیمان کرو تو میں یہ کام اپنے ذمے لیتا ہوں۔ سے

نال مذھیاں گھن ہیرخڑے توں تُساں بیٹھنا وچ بھنڈار ہیرے
اساں رُلاں گے آن کے وچ ویہڑے ساڈی کوئی نہ لیگا سار ہیرے
ٹکی دے کے ویہڑیوں کڈھ چھڈیں ساڈوں ٹھگ کے مول نہ مار ہیرے
اساں نال جے توڑ نبھاونی ای تیاں دیہہ کھاں قول قرار ہیرے

ہیر صدقِ دل سے قول دیتی ہے سے

اللہ سچ تے نبی برحق میاں سچا کراں میں قول قرار ماہی
تیری بندی ہاں ہجر ہے جان میری بھاویں ویچ لے ہٹ بازار ماہی

میتوں بُھلیاں نے ہور سب گلاں تیرے درس دی بس ہے کار ماہی
دامن دلاں میں تیرے سدا لگی جیویں جان نئیں یار اُتار ماہی
تیرے نام دا رات دن ذکر کرساں دیویں مہر دے نال دیدار ماہی
آپ کنڈاں ہنی جو جان اُتّے دیویں دلوں نہ مول وِسار ماہی
تیرے نال ایہہ قول نبھاوساں میں بھاویں جیت آوے بھاویں ہار ماہی
ہن جیوندی مکھ نہ موڑساں میں وارث شاہ تے رکھ اعتبار ماہی

ہیر جس والہانہ انداز میں رانجھے کے ساتھ نبھانے کا عہد کرتی ہے وہ عورت سے خاص ہے۔ مرد ابتدائے عشق میں بڑے جوش و خروش سے عہد و پیمان کرتے ہیں لیکن محبوب سے فیض یاب ہونے کے بعد سرد مہری اور بے رخی کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ عورت جو کچھ کہتی ہے کر دکھاتی ہے اور اپنی ساری عمر اور ساری اُمنگیں اپنی ساری تمنائیں پیار کی بازی پر لگا دیتی ہے۔ ہیر نے یہ کہہ کر پیار کرنے والی تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے ۔

تیرے نال ایہہ قول نبھاوساں میں بھاویں جیت آوے بھاویں ہار ماہی

اور یہ کامل سپردگی بھی تو عورت ہی کا حصہ ہے ۔

تیری باندی ہاں جچرے جان میری بھاویں ویچ لے ہٹ بازار ماہی

وفا عورت کی سرشت میں ہے مرد خال خال باوفا ہوتے ہیں۔

رانجھا مویشی لے کر بیلے چلا گیا۔ جہاں درختوں کے گھنے سائے میں بیٹھا ونجھلی بجایا کرتا۔ چند ہی روز میں بھینسیں بھی اس کی ونجھلی کی زبان سمجھنے لگیں۔ وہ جب چاہتا ونجھلی کی تانیں اڑا کر انہیں اپنے پاس بلا لیتا۔ ہیر تو ایک ایک تان پر دل و جان سے فدا تھی۔ وہ گھی شکر سے چوری کُٹ کر رانجھے کے پاس آتی اور اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا کرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے جوں جوں دن گذرتے گئے پیار کا زہر ان کے رگ و پے میں اترتا گیا۔ فطرت کے تقاضے پورے ہوئے۔ عشق کامل سپردگی چاہتا ہے اور اس کی تکمیل کامل سپردگی ہی سے ہوتی ہے ہیر اور

رانجھے نے جھل کے چھتنار درختوں کے نیچے پیار کا آبِ حیات گھونٹ گھونٹ پیا اور امر ہو گئے۔ انسان کا مقدر یہ ہے کہ جہاں اس کی مسرت انتہا کو پہنچتی ہے وہیں سے مسرت کے خاتمے کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔ مسرت کا نقطۂ عروج غم کا نقطۂ آغاز ہے۔ ان کی محبت کا راز طشت از بام ہوا، اور ہر کہیں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ان کے معاشقے کی خبر رانجھے کی بھابیوں نے سنی تو انھوں نے ہیر سے کہلا بھیجا کہ وہ رانجھے کو اپنے گھر واپس بھیج دے۔ ہیر نے جواب دیا کہ میں اس کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس جواب کا ایک ایک حرف ہیر کے جوشِ عشق پر دلالت کرتا ہے۔

تسیں ایس دے خیال نہ پوؤ اڑیو نہیں کھٹ کجھ ایس تے پیار اُتوں
تینوں میں جاندی اوس بن رہاں کیکوں گھول جندڑی جان دلدار اُتوں
میں تے ایہو وہاج وہاجیائی سودا کیتا ای جان ہمیار اُتوں
میرے کارنے چار دا پھرے مجھیں لکھدے لوک نے کسب روزگار اُتوں
جھلاں بیلیاں وچ اوہ پھرے بھوندا مر ویجدا میں گنہگار اُتوں
میرے واسطے کار کماوندا ئی میری جان گھول اوہدے کار اُتوں

پھر کہتی ہے ؎

سونپ پیراں نوں جھل وچ چھیڑدی ہاں مددا ایس دی خضر تے لوط ہے نی
جس وقت آوے بیلیوں چن چڑھدا رانجھا جا پڑدا وانگ ملکوت ہے نی
رانجھا بخشیا رب بہشت میوہ رس بھنڑہ مثل شہتوت ہے نی
وارث شاہ پھراں اوہدے مگر لگی اج تیک تاں رہیا اچھوت ہے نی

ہیر کا چچا کیدو لنگڑا ان کی تاک میں تھا۔ ایک دن اس نے آنکھ بچا کر ہیر کا پیچھا کیا۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہیر رانجھے کو چوری کھلا رہی ہے اور اس سے پیار کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر کیدو چل گیا۔ سیدھا بھائی کے گھر گیا اور سارا کچا چٹھا کہہ دیا۔ لوگ اسی طرح لگا کہ ہیر کے ماں باپ کو

کہہ سنایا۔ دوسرے دن وہ ہیر کے باپ چوچک کو اپنے ساتھ بیلے لے گیا اور درختوں کی اوٹ میں سے دکھایا کہ ہیر چاک پر صدقے قربان ہو رہی ہے۔ چوچک نے رانجھے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک مقررہ مدت تک اس کے مویشی چرائے گا تو ہیر اسے بیاہ دی جائے گی لیکن کیدو کے اکسانے پر اس نے ہیر کا بیاہ سیدے کھیڑے سے کرنے کی ٹھان لی۔ ہیر کو اس بات کی بھنک پڑی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ ایک دن ہیر کی ماں ملکی نے اپنی بیٹی کو سخت سُست کہا اور دھمکیاں دیں تو ہیر نے صاف صاف کہہ دیا کہ تم لوگ اپنے قول سے پھر گئے ہو مگر میں اپنا عہد نبھاؤں گی۔ ؎

ہیر کڑک کے آکھدی ماؤں تائیں مینوں شوق نہ چاہ ویاہ دے نے
رانجھے نال ہوئی جند جان اکو لکھے لیکھ ایہہ دھروں درگاہ دے نے
دل وجان تھیں میں حاضر گولڑی آں اگے میئیں رانجھے بادشاہ دے نے
چاک میرا تے بندی میں چاک دی ہاں وعدے ازل دے توڑ نباہ دے نے
میرے نہیں مائے رانجھے یار دے نے دم چوتی ہزار جو ساہ دے نے
بناں آئی تقدیر میں نہیں مرنا تیرے ہتھ نہ حکم نشاہ دے نے

انداز بیان قابلِ داد ہے۔ کہتی ہے ”رانجھا میرا غلام ہے اور میں اس کی لونڈی ہوں۔ پھر ماں سے کہتی ہے۔ ؎

بیلے وِرس دیدار جو کراں جا کے میرا ایہو معراج کمال مائے
حج کعبے دا چاک نوں جانیا میں میری عمر دی کی مجال مائے
بیلے جاؤ نوں مول نہ رُکانگی میں توڑے کھوہ اندر گھتو گال مائے
رانجھے ہیر دیوچ تر دخل کوئی ایس گل نوں سوتر سمبھال مائے
میرا چاک نوں ساک اقرار کر کے پھیر گل دتی پچھوں شال مائے
جے کر چاک نوں ساک نہیں دیونا سی کرنا نہیں سی ایڈ جلال مائے

کر کے قول زبان نہ ہار ساں میں ایسے یار توں مڑن محال مائے
رانجھے یار دے کھیڑے دربان ہو کے ولی غوث تے قطب ابدال مائے

ہمارے دیہات میں بیٹی نڈر ہو کر اپنی ماں سے بات کر لیتی ہے مگر بھائی سے خوفزدہ ہوتی ہے۔ ہیر نے جب یہ سُنا کہ اس کے ماں باپ اپنے قول سے منحرف ہو کر اسے سیدے کھیڑے سے بیاہ رہے ہیں تو اس نے اپنے بھائی سلطان کے سامنے بھی برملا کہہ دیا کہ وہ جان پر کھیل جائے گی لیکن رانجھے کا دامن کسی صورت نہیں چھوڑے گی۔

اکھیاں لگیاں ہٹن نہ ویر میرے بیبا واریاں اُتے ہاریاں وے
وہن چڑھے دریا نہیں کدی مُڑدے وڈے لائیے زور زاریاں وے
ایہہ بدی نہ مٹے نصیب وچوں بھاویں وڈ توں نال تلواریاں وے
اکھیاں روز الست دا مٹے ناہیں ہیر گھول گھتی وارو واریاں وے
لہو کریں نہ نکلے وس بھائی جہتے لگیاں تیز کٹاریاں وے
ہس دتیاں باجھ نہ عشق پکے ایہہ نہیں سُکھالیاں یاریاں وے
خوشیاں نال قربان کر عشق اُتوں بھنیاں ہون جے لکھ ہزاریاں وے
لکھاں داروان نال نہ ہون چنگے جنہاں لگیاں عشق بیماریاں وے
رانجھے چاک دے پیر دی خاک اُتوں وار گھتیاں اساں سرداریاں وے
اشتیاق مرجح چاک دے پیراں اُوڈی میرے وچ ہے زور بلکاریاں وے

ہوتی ہو کر رہی سیدے کھیڑے کی بارات بڑی دھوم دھام سے سیالوں کے گھر آئی۔ ابتدائی رسوم کے بعد نکاح کا جلسہ برپا ہوا۔ ایجاب و قبول کے وقت ہیر نے نکاح سے انکار کر دیا۔ قاضی نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ہیر اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ قاضی اور ہیر میں ایک طویل مکالمہ ہوا۔ قاضی شریعت کے مسائل بیان کرنے لگا اور ہیر شرع عشق کا دفتر کھول بیٹھی۔ قاضی سے کہا:

میرے عشق نوں جاننداد ھول باشک لوح قلم تے زمین آسمان میاں

رانجھا چھڈ کے نظر نہ ہیر کرساں بھاویں چل کے آوے سلطان میاں
مینتاں کدی نہ چھڈساں رانجھنے نوں بھاویں دور کرو میری جان میاں
مینتاں رانجھنا رانجھنا کوکساں گی پچھ جان دے وتج میری جان میاں

جناب قاضی کے لئے یہ زبان ناقابل فہم تھی۔ انھوں نے کہا جسے تم عشق کہتی ہو وہ سراسر تمہاری بدمستی اور ہوس ناکی ہے۔

ترا عشق ہیرے اساں سمجھ لیا لچ پنے تے جھدی سبنا بی بی
اہناں عشق ناہیں تری نری مستی بری چال دی ایہہ ادا بی بی

ہیر برجستہ کہتی ہے۔

ہیر آکھیا عشق دا راہ پوناں ہیں کم ملوانیاں قاضیاں دا
ایس عشق میدان دے کٹھیاں نوں رتبہ کربلا دیاں غازیاں دا
ترت وچ درگاہ منظور ہوئے سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی ایہہ کم نہ جھوٹیاں پا زیاں دا
رانجھا نال ایمان قبولیا میں قصہ ختم کر دور درازیاں دا
رانجھا چھڈ کے انگ نہ لاں کھیڑہ جندا گدھے نوں حق نہ تازیاں دا

ہیر کہتی ہے کہ عشق کی راہ میں جان نثار کرنے والوں کو شہدائے کربلا کا رتبہ ملتا ہے۔ ملاؤں اور قاضیوں جیسے پاجی کیا جانیں حق کی راہ میں جان کیسے قربان کی جاتی ہے۔ درگاہ باری تعالیٰ میں عشاق صادق کے سجدے ہی قبول ہوتے ہیں۔ رانجھا میرا ایمان ہے اسے چھوڑ کر سیدے سے ملاپ کرنا ایسا ہے جیسے گدھے کو اسپ تازی کا حق دیا جائے۔ ہیر یاد دلاتی ہے کہ اس کے ماں باپ نے اسے رانجھے سے بیاہنے کا عہد کیا تھا۔

پہلاں ماں تے باپ اقرار کیتا ہیر رانجھے دے نال ویاہنی اے
اساں اوسدے نال زبان کیتی لب گوردے تیک نباہنی اے

انت رانجھے نوں ہیر پناہ دیتی کسی روز دی ایہہ پڑھنی اے
وارث شاہ نہ جاندی میں کملی خورش شیر دی گدھے نوں ڈاہنی لے

لیکن قاضی صاحب کی مٹھی گرم کی گئی تھی وہ پنجے جھاڑ کر ہیر کے پیچھے پڑ گئے اور مسائل بیان کرنے لگے، تو ہیر غضبناک ہوگئی۔ اس نے کہا جب تک میری جان میں جان ہے میں رانجھے کو نہیں چھوڑوں گی۔ اے قاضی تو ناحق جان کھپاتا ہے۔ میں تیرے مسائل سننا نہیں چاہتی۔ مجھے تلوار سے کاٹ دیا گیا تو بھی رانجھے کو نہیں چھوڑوں گی۔ رانجھے کا دیدار گویا مجھے حسینؓ شہید کا دیدار ہے اور سید کھیڑا تو مجھے شمر اور یزید لعین کی طرح زہر لگتا ہے۔ رانجھے کی پیشانی میرے لئے مسجد کی محراب ہے جس میں میں سجدے کیا کرتی ہوں۔ ؎

غصہ کھائیکے ہیر سیال کہندی جیب لگ جان نہ رانجھے توں مڑاواندی
تیریاں سلیاں دی نہیں جاہ مینوں کاہنوں کرنائیں قاضیا مغز ماری
میں تاں جیوندی مڑاں نہ رانجھنے توں بھاویں کٹے تلوار دی تیز دھاری
ایہہ رب دیاں بے پرواہیاں نے لائی عشق دریا وچ اساں تاری
رانجھے دید شہید حسینؓ مینوں کھیڑا شمر یزید لعین قاضی
متھا چاک دا خاص محراب مسجد سجدے پئیں آں نال یقین قاضی

جب ہیر کے باپ اور چچا نے دیکھا کہ ہیر نے نکاح سے انکار کر دیا ہے تو انھوں نے قاضی سے کہہ کر بغیر ایجاب و قبول ہی کے ہیر کا نکاح سید سے کھیڑے سے پڑھوا دیا۔ اور رخصت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہیر موقع پا کر رانجھے سے ملی اور بصد حسرت و اندوہ اس سے رخصت ہوئی۔ ؎

ہیر آکھدی چاک نوں آنیڑے گلیں لگ ملیئے جاندے وار جانی
ایس دید نوں ترسدے رہن گے نے ساڈے نین خونی اشکبار جانی
رب میلے تے ملاں گے ہیر مڑکے قسمت نال ہوساں تیم پید جانی
ہُن جا لیئے ریجھ لاہ کے تے جیتی گھت کے باہر اُلار جانی

آخری مصرعہ بڑا جاندار ہے۔ کہتی ہے آؤ میرے گلے میں باہیں حمائل کر کے مجھے بھینچ بھینچ کر سینے سے لگاؤ تاکہ شوقِ ملاقات کی کچھ تسکین تو ہو۔

رانجھا شکایت کے پیرائے میں کہتا ہے ؎

کر کے قول زبان بے ہارڈی نار بیار دی دلوں نہ توڑ ہیرے
پہلوں نال پیار دے ٹھگیونی ہُن کھاتیاں کریں کروڑ ہیرے
جھاکا دے کے باغ بہشت والا ساتوں چلیں کلیں چھوڑ ہیرے
کرنیئے ساتھوں تے پار اتار دیئیے مجھو وِچ نہ سٹئیے بوڑ ہیرے
پیڑ ویلنے وِچ کماد وانگوں میرا چلیں رس نچوڑ ہیرے
آپ پری بن کے اُڈ نہار ہویوں ساتوں عشق دا جِن چھوڑ ہیرے

کیا خوب کہا ہے۔ اپنے حسن کے باغِ بہشت کی جھلک دِکھا کر اب مجھے تنور بنجر میں چھوڑے جا رہی ہو۔ پیار کی ناؤ میں سوار کر کے بیچ منجدھار ڈبو دیا پار نہیں لگایا۔ خود تو پری بن کے اُڑی جا رہی ہو اور عشق کا جن مجھے چپٹا دیا ہے۔ تو نے میری زندگی کا رس ایسے نچوڑ لیا ہے جیسے گنے کا رس نچوڑ لیا جاتا ہے۔

مگر رانجھے کی یہ شکایت بے جا تھی۔ ہیر نے بارات آنے سے پہلے رانجھے سے کہا تھا۔ آؤ تخت ہزارے بھاگ جائیں لیکن رانجھا متردد تھا مگر اب اُلٹا شکایت کرنے لگا۔ آخر وہ تقدیر کا سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جدائی روزِ ازل ہی سے ہماری قسمت میں لکھی تھی ؎

ساڈی پیش نہ جاوندی ذرا اوتھے جتھے کھیڑیاں تیراں لکیاں نے
وارث شاہ خدا نوں سونپیوں توں ساڈے بھا ایہہ دھروں جُدائیاں نے

ہیر سسرال پہنچ کر سخت اُداس ہو گئی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ روز بروز دُبلی ہونے لگی۔ وہ ایسی مریضہ تھی جسے بظاہر کوئی دُکھ روگ نہیں تھا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جُدائی کے نیزے کی اَنی جگر میں رہ رہ کر چُبھتی اور وہ اس کونج کی طرح کُرلاتی جو اپنے قافلے سے جدا ہو گئی ہو۔ منہ پر مُہرِ خاموشی

لگ گئی۔ رانجھے کا مکھڑا ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا اور سیدے پر لعنت بھیجا کرتی۔ رانجھے سے جو پیمانِ وفا ناؤ پر باندھا تھا اس کی یاد میں مگن رہتی۔ ؎

ہیر ساہورے گھراں وِچ قید ہوئی سُوندی بھندی طعام نہ کھاوندڑی اے
دنوں دن اوہ سکدی جاوندی اے باجھ درد تے سول درماندڑی اے
کسے نال نہ ہس کے بولدی اے منہ گنج کے پئی شرماوندڑی اے
سانگ وِچ کلیجے دے اڑکدی اے سینہ خنجروں پئی کُساوندڑی اے
گھروں کڈھ کے ماپیاں دُور سٹی ڈاروں وچھڑی کونج کرلاوندڑی اے
کِسے نال نہ بولدی چالدی اے فکراں وِچ ایہہ جان گواوندڑی اے
صورت رانجھے دی اکھیاں وِچ رکھے ہر سیدڑے تے بھس پاوندڑی اے
ہیڑی والڑا قول سُو یاد پکا اک پلک نہ دِلوں بھلاوندڑی اے

کہتی ہے کوئی محرم راز نہیں ملتا کس کے سامنے اپنا دُکھڑا بیان کروں ؎

کوہی وانگ دن رات کرلاوندی نوں پیا وِچ کلیجڑے گھا مَینوں
وارث شاہ میاں کنھو حال دساں محرم نہیں کوئی نظری آ مَینوں

ہیر کی جُدائی میں رانجھے کا حال بھی زبوں تھا۔ وہ دیوانہ وار بیلے میں گھومتا پھرتا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اسی حال میں ہیر کو پیغام بھیجا۔ اس میں کہتا ہے ؎

سینہ سانگ فراق نے پاڑ دتا سیریں گھا او دلبرا واسطا ئی
تیرے عشق دے ڈھولاں دی بنب بولے "دھراہ" "دھراہ" او دلبرا واسطا ئی
جان لباں تے آن کے اٹک رہی کریں فناہ او دلبرا واسطا ئی
رنگ زرد دم سرد تے نین خونی نہیں وساہ او دلبرا واسطا ئی

"دھراہ" "دھراہ" صوتی لفظ ہے۔ بنب وہ شور جو بہت سے ڈھول اکٹھے پیٹنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بڑی خوبصورت تشبیہ ہے۔ کہتا ہے کہ شورشِ عشق نے میرے دل میں بے پناہ ہنگامہ

پھاڑ دیا ہے جیسے بہت سے ڈھول اکٹھے پیٹے جا رہے ہوں۔ ہیر رانجھے کو اپنے پیام میں کہتی ہے ؎

تیرے نام دا رات دِن ذکر کر دی وانگ زاہداں لا کے جھُٹیاں میں
ساری رات گذار دی ذکر اندر اک پلک یاد نہ فیس چھُٹیاں میں
تینوں آکھیا سُو جلدی آ ماہی کاہنوں وِچ فراق دے سٹیاں میں
روز ازل تھیں سجناں نال تیرے پکی جکڑ کے رب نے جُٹیاں میں

طرزِ ادا کی لطافت ملاحظہ ہو۔ کہتی ہے کہ میں رات بھر تیرا نام جپتی ہوں جیسے زاہدِ شب زندہ دار بار بار جھوم جھوم کر ذکر اذکار کرتا ہے۔ میرے پیارے میرا دامن تو روزِ ازل سے خدا نے تیرے دامن سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیا تھا جلدی آ میں تیری جُدائی میں تڑپ رہی ہوں۔

وارث شاہ نے ہیر کے دردِ فراق اور سوزِ ہجر کو ہیر کی زبان میں ایک بارہ ماسے میں بیان کیا ہے۔ یہ بارہ ماسہ عشقیہ شاعری کا ایک بلند پایہ شاہکار ہے جس کی مثال شاید خواجہ غلام فرید کی کافیوں، میراں کے بھجنوں اور غزل الغزلات کے سوا دنیائے ادب میں کہیں نہیں ملے گی۔ عورت کی زبان سے برہا کے دُکھ اور شوقِ وصال کا بیان خالصتاً ملکی روایت ہے جو سندھی، پنجابی، بنگالی اور ہندی شاعری سے ہڑپہ اور موہن جو دڑو (یہ ترکیب پنجابی کی ہے یعنی مویاں دی ڈھیری) کے مادری نظامِ معاشرہ تک پہنچتی ہے۔ مصرِ قدیم کے ابتدائی دور کے مادری نظامِ معاشرہ میں بھی جس میں سماجی لحاظ سے عورت کو مرد پر فوقیت حاصل تھی۔ عورت ہی اظہارِ عشق میں پہل کرتی تھی۔ ایسی کئی نظمیں ہم تک پہنچی ہیں یہی حال ہڑپہ اور موہن جو دڑو کے مادری نظامِ معاشرہ کا تھا۔ کرشن اور رادھا کا معاشقہ اسی معاشرے سے یادگار ہے۔ سیاہ فام کرشن (لغوی معنی "کالا") بقول پروفیسر رادھا کرشنن، گورے چِٹّے آریاؤں کا دیوتا نہیں ہو سکتا تھا۔ شِو اور کالی دیوی کے ساتھ کرشن بھی ہڑپہ اور موہن جو دڑو کی دیو مالا سے آریائی دیو مالا میں آیا تھا۔ گیتا کا فلسفی کرشن اس دیوتا کا آریائی سروپ ہے جبکہ بندرابن کا مکھن چور

رادھا کا محبوب اور گوپیوں کا کاہن اس کا اصل دراوڑی رُوپ ہے جو آج بھی بھارت میں باقی برقرار ہے۔ گیتا گوونڈا میں رادھا کرشن سے اظہارِ عشق کرتی ہے۔ میراں کے بھجنوں میں اس راجپوت شہزادی نے پر جوش انداز میں کرشن سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ مرد سے عورت کے اظہارِ عشق میں پہل کرنے کی یہ روایت سندھی، پنجابی، بنگالی اور اکثر دکنی زبانوں میں آج تک موجود ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی اور خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں بھی سسّی نے پنّوں سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ وارث شاہ کے بارہ ماسہ میں بھی یہی روایت دکھائی دیتی ہے۔ یہ بارہ ماسہ اکسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش کریں گے :-

چھُری عشق دی کٹ کے وانگ قیمے گھت بربوں دی دیگ تہا یاں میں
ایس دیلڑے نوں نہیں جاندی ساں ہس رس کے انکھیاں لا یاں ہیں
اونھوں شوق دے نال گل لاوندی ساں مونھوں آکھدی ساں تیری تریڑیاں میں
وارث شاہ قضا جُدا کیتی عرضیاں کیتیاں رو مبتیریاں میں
ایس ماہ دیوچ سہیلیو نی میرا جی چاہے بیلے جاوڑنے نوں
پیلکے مہوندی نے بیلے جاوندی ساں رانجھے یار دے انگ لگاوڑنے نوں
دردخواہ رانجھے باجھ کون ہووے بندی ہیر دی بیڑ ونڈاوڑنے نوں
تتی ہیر بیمار دا وید رانجھا کدوں آوسی روگ گواوڑنے نوں
مرحکی ہاں روندڑی وتج درداں جانی میل توں درد ہٹاوڑنے نوں
کرکے سُکھاں دی آس دلوچ بھاری اساں جھکیاسی ایس جاوڑنے نوں
سوہنا کتے دی نظر نہ آوندا اُجیت نت چاہے درید پاوڑنے نوں
وارث شاہ رنجھیٹے نوں نال لیکے جاندی روز جھناں تے نہاوڑنے نوں
کسے روز دا حسُن براہونائی سرکیے دے وری بچھا مریئے

بُھٹھ تکنی آس بیگانڑی جی ہتھیں اپنیں خیر کما مریئے

ربے دلے دے وِچ افسوس ناہیں یار رَج کے گلے لگا مریئے

وارث شاہ نہ ملے درگاہ ڈھوئی جے کر یار توں مُکھ بھوا مریئے

چڑھدے ہاڑ دیوِچ حیران جیتی بل بل اگ سینے وِچ بھجدی اے

بات دِلے دی کھول نہ دسدی اے وانگ سیخ کباب دے بھجدی اے

سینے وِچ فراق دی سانگ رڑکے برچھی وانگ اڈیس جو بھجدی اے

ہنت بھجدی پاندھیاں راہیاں نوں کوئی خبر نہ دسدا انجھ دی اے

جب جدائی کی تاب نہ رہی تو ہیر نے رانجھے کو کہلا بھیجا کہ جوگی کا بھیس بدل کر آؤ اور مجھے ملو۔

تینوں حال دی گل میں لکھ گھلاں ترت ہو فقیر تیں آونائیں

کسے جوگی دا جا کے بنیں چیلا سواہ لائے کے کن پڑوا ونائیں

چٹھی میں ہیر رانجھے کو اپنے حسن و جمال سے فیض یاب ہونے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

اگے چونڈیاں نال ہنڈایا ئی زلف کنڈلاں دا ہن ویکھ میاں

گھت کنڈلاں ناگ سیاہ پلمن ویکھے اوہ جس بھلا ہے لیکھ میاں

دنداں ملاں لتے او ہر دنداسڑے نوں نیں خونیاں دے بھرن بھیکھ میاں

حسن دی دید کر دیکھ زلفاں خونی نیناں دے کرن پریکھ میاں

کہتی ہے کہ پہلے تو تم نے میرے کنوارپنے کے حسن کے مزے لوٹے تھے جب میں چونڈیاں گندھایا کرتی تھی۔ اب آؤ اور زلفِ دراز اور پُر پیچ کے نظارے سے بھی لطف اُٹھاؤ۔ میں ابٹن اور دنداسہ ملتی ہوں تو میری آنکھیں جوشِ جوانی سے لال ہو جاتی ہیں جن پر میری زلفیں ناگ کی طرح لہراتی ہیں۔

دیوانہ را ہوئے بس است۔ رانجھا ٹلہ جوگیاں پہنچا۔ گرو بالناتھ سے جوگ لیا۔ گرو نے اس کے کان چھید کر اس میں بالے ڈال دیئے۔ اسے کھپری سیلا اور ناد دیئے اور نصیحت

کی کہ بیٹا پاکبازی کی زندگی گذارنا اور کسی جوان عورت کی طرف نہ دیکھنا۔ رانجھا بولا مجھے ہیر دِلا دیجئے۔ اس کے سوا مجھے کسی عورت کی چاہت نہیں ہے۔ میں اور ہیر آغاز شباب سے ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ عشق کا ناگ میرے سینے میں کنڈلی مارے بیٹھا میرا خون چاٹ رہا ہے۔ اور جدائی کا درد میرے سراپا میں رچ بس گیا ہے۔ دوسری عورتوں سے میں ایسے ڈرتا ہوں جیسے دیا ہوا سے ڈرتا ہے۔ مجھے ہیر بخش دی جائے ۔ ؎

ناگ عشق دا بیٹھا ہے وِچ سینے کنڈلی مار جس خون نوں کھونڈنا ئی
وارث شاہ دانگوں ہیر طن باجھوں ہڈ ماس ساڈا بجر چونڈنا ئی

رَل کے ہیر دے نال سی عمر جالی اساں مزے جوانی دے خوب کیتے
ہیر چھتیاں نال میں مس کھناں اساں ودہاں نے عیش مرغوب کیتے

مینوں ہیر دی طلب ہے ہیر بخشو ہیر ہیر میرا جیو منگ دائی
نا ہتھا داؤ کولوں جیویں ڈرے دیوا تویں حور ناں توں جیو سنگدائی

رانجھا جوگی بن کر ٹلہ جوگیاں سے نیچے اُترا اور مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا سیدھا رنگ پور جا پہنچا۔ بستی کے باہر ایک باغ میں ڈیرے ڈال دیئے۔ آگ سلگائی اور سادھی میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ عورتوں کا جمگھٹ لگ گیا۔ وہ اس کے گرد حلقے میں بیٹھ کر اپنے دُکھڑے رونے لگیں اور مرادیں مانگنے لگیں۔ جوگی کے مردانہ حسن کے نظارے نے عورتوں کو مبہوت کر دیا۔ اور ہر کہیں اس کے بھرپور شباب اور مست انکھڑیوں کے چرچے ہونے لگے۔ ہوتے ہوتے بات ہیر کے کانوں تک جا پہنچی۔ جب ہیر کی سہیلیوں نے جوگی کا سراپا بیان کیا تو ہیر جان گئی کہ رانجھا اس کے کہنے کے مطابق جوگی بن کر آگیا ہے۔ یہ سُن کر ہیر کے جذبات میں بے پناہ ہیجان برپا ہو گیا اور کہنے لگی ؎

مٹھی مٹھی ایہہ گل نہ کرو بھینیاں میتاں سُندیاں ای مر گئی جے نی
تساں ایہہ جدر کہی گل کیتی کھلی تی ای میں کُرھ بہی جے نی

رب جھوٹ نہ کرے جے ہوئے رانجھا تاں میں چوڑ ہویاں ملیوں پٹیا سُو

اگے اگ فراق نے ساڑ سُٹی سڑی بلی نوں پھیر کیوں پھٹیا سُو

نالے رتن گئی نالے کن پاٹے ایس عشق بھلیں نفع کی کھٹیا سُو

میرے واسطے دُکھڑے پھرے کردا لوہا تا جیہبے نال چٹیا سُو

خون جگر دا عشق دے کھیت اندر چھانٹیاں والا کے جھٹیا سُو

قدم رکھدا سی وچ واتیاں دے میتوں پاٹیکے پچھ وچ چھٹیا سُو

ایہ رانجھا پھُل گلاب دا سی میرے ہجر اندر روپ گھٹیا سُو

تیغ عشق دی نال شہید ہویا ویکھ سیدڑا سیس تے ڈٹیا سُو

ہویا چاک پھیر مل سو خاک پنڈے لاہ ننگ ناموس نوں سٹیا سُو

پُکل وچ چوری چوری ہیر روے گھڑا نیر دا جا الٹیا سُو

ظاہر نہ روے دلوں آہ مارے اکھیں جگر دا خون پلٹیا سُو

نی میں گھول گھتی سکھیا رڑا سی میرے واسطے دکھ ترٹیا سُو

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ عورت کی نفسیات کے بہت بڑے مبصر ہیں جب کوئی عورت یہ دیکھتی ہے کہ اس کا شیدائی اس کے لئے کڑیاں جھیل رہا ہے تو وہ دل و جان سے اس پر فدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی رسوائی کا خوف بھی ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ چنانچہ اس خوف سے ہیر بھی آزاد نہیں ہے جس نے علی الاعلان رانجھے کے ساتھ اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔

دوسرے دن رانجھا کھپری لے کر بھیک مانگنے کے لئے گھر گھر پھرنے لگا۔ یہ تو ایک بہانہ تھا۔ گھومتا گھامتا سیدے کھیڑے کے گھر جا پہنچا اور صدا لگائی۔ ہیر کی نند سہتی نہایت شوخ بیباک اور منہ پھٹ تھی۔ اس نے رانجھے کے خوب خوب لتے لیے اور طعنوں مہنوں سے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ ایک مدت کے بعد چاہنے والوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو دونوں پر کیا کیا عالم

نہ گذر گئے ہوں گے لیکن دونوں نے مصلحت بینی سے کام لیا۔ جوگی ہیر سے کہنے لگا کوئی مُراد ہو تو مانگ لو۔ ہیر نے بڑے ذومعنی انداز میں اپنے غمِ فراق کا ذکر کیا ؎

ہیر آکھدی جوگیا جھُوٹھ بولیں کون رُٹھڑے یار مناوندا ئی
ایسا ملیا نہ کوئی میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیاوندا ئی
بھلا موئے تے وِچھڑے کون میلے ایویں جیوڑا لوک ولاوندا ئی
دُکھاں والیاں نوں گلّاں سُکھ دیاں قصے جوڑ جہان سُناوندا ئی

سہتی ایک ہی کائیاں تھی۔ وہ پیار بھری آنکھوں کی زبان سمجھتی تھی کہ خود بھی مُراد بلوچ سے پیار کرتی تھی۔ جب ہیر اور رانجھا بُت بنے ایک دوسرے کی طرف وفورِ شوق سے لرزتی نگاہوں سے دیکھنے لگے تو وہ سب کچھ بھانپ گئی۔ اور رانجھے کو خوب جلی کٹی سنائیں لیکن رانجھے نے یہ کہہ کر اسے رام کر لیا کہ وہ اسے مراد بلوچ سے ملا دے گا۔ اب سہتی اور ہیر میں ملی بھگت ہو گئی۔ اور ہیر نے رانجھے سے ملنے کا منصوبہ بنایا۔ ایک دن بناؤ سنگار کر کے وہ ایسے وقت باغ میں گئی جب وہاں خانہ بے تشویش تھا۔ جدائی کی آگ میں پھُنکے ہوئے اور ناآسودہ تمناؤں کے ستائے ہوئے عشاق جب تنہائی میں ملے تو ان کے ارمان سُلگ اُٹھے اور یارائے ضبط نہ رہا۔ وصال کا یہ منظر ہیر وارث شاہ کے حسین ترین مقامات میں سے ہے۔ ؎

گھُنڈ لاہ کے ہیر دیدار دِتّا رہیا ہوش نہ عقل تھیں طاق کیتا
لنک باغ دی پری نے جھاک دیکھے سینہ چاک دا پاڑ کے چاک کیتا
بھٹھ ماپیاں ظالماں ٹور دِتّی تیرے عشق نے مار ہلاک کیتا
ماں باپ تے ساک بھُلا بیٹھی اساں تُدھ نوں اپنا ساک کیتا
تیرے باجھ نہ کسے نوں انگ لایا شاہد حال دا رب میں پاک کیتا
امانت اپنی دیکھ توں آمن اندر سینہ ساڑ کے برہوں نے خاک کیتا

یہ کہہ کر ہیر بے اختیار آگے بڑھی ؎

اوّل پیر پگڑے اعتقاد کر کے پھیر نال کلیجے دے لگ گئی
نواں طور عجوبے دا نظر آیا جل ویکھ پتنگ تے اگ گئی
رانجھا شوق دے نال اُٹھ کھڑا ہویا واہ عشق دی دوہاں نوں وگ گئی
جدوں یار نوں یار سی آن ملیا حرص دوہاں دی اندروں بھگ گئی
اگے دُھواں دُھکیندڑا جوگڑے دا اگ چھوکری نال سلگ گئی
دونویں مست دیدار وچ جھولدے سن زہر شوق دی دھا ہر رگ گئی

کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ عام طور سے پتنگ آگ پر جل مرتا ہے لیکن آج پتنگ آگ جل گئی۔ ہیر کو سینے سے لگاتے ہی جوگی کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کا دُھواں شعلہ بن کر بھڑک اُٹھا۔ اس کے بعد حالات کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ سہتی اور ہیر نے مل کر اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بھاگ جانے کی تدبیر سوچی۔ ایک دن ہیر کے پیر میں کانٹا چبھو کر سہتی نے شور مچا دیا کہ ہیر کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ہیر نے بھی آنکھیں موند لیں۔ کھیڑے "جوگی" کو بلا لائے۔ اُس نے کہا میں رات کو منتر پڑھوں گا مگر شرط یہ ہے کہ سہتی کے سوا کوئی شخص قریب نہ پھٹکنے پائے۔ کھیڑے غافل ہو کر سو گئے تو مراد بلوچ آ گیا اور رات کی تاریکی میں چاروں بھاگ نکلے۔ صبح کھیڑوں کو خبر ہوئی تو وہ تعاقب میں دوڑے اور اُنھیں جا لیا۔ مراد بلوچ کے ساتھیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انھیں مار بھگایا۔ لیکن رانجھا پکڑا گیا۔ کھیڑے عدالت میں گئے۔ قاضی نے ان کے حق میں فتویٰ دیا۔ رانجھے نے منتر پڑھ کر شہر کو آگ لگا دی۔ راجہ ڈر گیا اور اس نے ہیر رانجھے کے حوالے کر دی۔ شومیِ قسمت سے رانجھا ہیر کو اس کے باپ کے گھر لے گیا۔ چوچک اور کیدو نے بظاہر گرم جوشی سے ان کی آؤ بھگت کی اور رانجھے سے کہا کہ وہ تخت ہزارے جا کر بارات لے آئے تاکہ ہیر اسے بیاہ دی جائے۔ رانجھا چلا گیا تو کیدو نے ہیر سے کہا کہ رانجھا قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ سُن کر ہیر تیورا کر گری اور بیمار پڑ گئی۔ اسی حالت میں اسے زہر دے دیا گیا۔ رانجھے نے ہیر کی موت کی خبر سُنی تو وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکا اور جاں بحق ہوا۔ اس طرح یہ المیہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

ہیر وارث شاہ کے کردار

ہیر : ہیر جھنگ کے سیال جاٹوں کے ایک خوشحال گھرانے کی ناز پروردہ لڑکی تھی۔ باپ کی چہیتی، ماں کی لاڈلی۔ بچپن ہنسی چہل میں گذرا۔ جوانی قیامت بن کر آئی۔ دیکھتے دیکھتے اس اُلھڑ کھلنڈری لڑکی نے ایک جادو نگاہ حسینہ کا روپ دھار لیا۔ جھنگ کی عورتیں اپنے حسنِ قامت، تناسبِ اعضا، جسم کے زاویوں کی رعنائی اور خطوط کی دلآویزی کے لئے یگانۂ روزگار تھیں۔ وارث شاہ نے ان کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف جا بجا کی ہے۔ ہیر اس باغ کا سروِ رواں اور گلِ سرسبد تھی۔

جیندے ہوٹھ نبات تے شکر پارے، گلاں وچ سواد کھانیاں دا
اوس باغ دا سرُو سی ہیر جٹی شاہی باغ جو جھنگ مگھیانیاں دا

کہتے ہیں کہ وہ ہزار عورتوں میں کھڑی ہوتی تو بھی اس کا حسن نمایاں ہوتا۔ ع

گجھی رہے نہ ہیر ہزار وچوں

ہیر کا معمول تھا کہ وہ ہر روز اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں دریا کے کنارے جایا کرتی۔ ناؤ پر پلنگ بچھا رہتا اور اس پر پھولوں کی سیج سجی رہتی۔ ہیر کبھی پلنگ پر نیم دراز دریا کی سیر کیا کرتی اور کبھی دریا کے کنارے باغ میں پینگیں اور گدا ناچتی۔ اس کے حسن کا شہرہ دُور دُور تک پہنچ گیا۔

وہ اپنے روپ میں مست تھی اور کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ غرورِ حسن کے ساتھ غرورِ تموّل بھی شامل تھا۔ تند مزاج ایسی تھی کہ جب اُس نے اپنے پلنگ پر ایک اجنبی کو دراز دیکھا تو لُڈّن ملاح پر برس پڑی ہے

دَس لُڈّناں کالیا کدھناں نوں کسے اساں دا پلنگ خراب کیتا
میری سیج تے کون سوالیا جے میرا مُجھ نہ ادب آداب کیتا

وہ رانجھے کو مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ شوق و آرزو سے لرزتی ہوئی ایک نگاہ سے پیار کا وہ معجزہ رونما ہوا جس نے ہیر کے غرورِ حسن کو عاجزی میں، الہڑپنے کو سنجیدگی میں، تکبّر کو دردمندی میں، شوخی کو حیرت میں، غصے کو پشیمانی میں اور تُندخوئی کو نرم روی میں بدل دیا۔ لاڈلے اور خوبصورت لوگ اوّل تو کسی سے پیار ہی نہیں کرتے لیکن پیار کریں تو دل و جان سے کرتے ہیں۔ کہ بھرپور پیار وہی کر سکتا ہے جس سے بھرپور پیار کیا گیا ہو۔ ان کے پیار کی کوئی حد و غایت نہیں ہوتی۔ اور ان کی سپردگی والہانہ ہوتی ہے۔ جولیٹ رومیو سے کہتی ہے :

میری بخشش سمندر کی طرح ناپیدا کنار ہے
میرا پیار سمندر ہی کی طرح گہرا ہے
میں جتنا تم سے پیار کرتی ہوں اتنا ہی وہ بڑھتا ہے۔
کیونکہ پیار کی نہ کوئی حد ہے نہ غایت۔ "

حسن کی دیوی وینس اپنے محبوب ادونس سے کہتی ہے :

" سر جھکائے کیوں بیٹھے ہو۔ سر اُٹھا کر میری آنکھوں کی پتلیوں میں دیکھو
جہاں تمہارے حسن کا عکس پڑتا ہے۔
جب نگاہ سے نگاہ ملے تو ہونٹوں کو ہونٹوں سے مل جانا چاہیئے
وقت نہ گنواؤ، ان لمحات کو ہاتھ سے نہ جانے دو
کھلے ہوئے خوبصورت پھول چُن نہ لئے جائیں تو وہ جلد ہی مرجھا کر فنا ہو جاتے ہیں . . .

میرے بوسوں سے تمہارا دم گھُٹ جائے گا لیکن تمہارے ہونٹوں کی پیاس بھڑک اٹھے گی۔
آرزو کی شدت سے کبھی تمہارے ہونٹ سرخ ہو جائیں گے اور کبھی پیلے پڑ جائیں گے
میرے دس بوسے ایک بوسے کی طرح مختصر اور ایک بوسہ میں بوسوں جتنا طویل ہو گا۔"
ہیر بناؤ سنگار کر کے رانجھے سے ملنے باغ میں جاتی ہے۔ ؎

ہیر آکھیا جا کے کھول ٹُکّل اوہدے ویس نوں پھوک دکھاونی ہاں
اوہدے پیراں دی خاک ہے جان میری جیو جان تقیں گھول گھماونی ہاں
موہیا پیا اے نال فراق جوگی عیسٰی وانگ میں ویکھ جواونی ہاں
وارث شاہ پتنگ نوں شمع اُتّے اگ لا کے ویکھ جلاونی ہاں

پھر کہتی ہے ؎

آ کے جوبنے اج بہار دتّی جیویں بُوٹا پانی تے جھگ وائی
کھُل کھُل جاندے بند چولڑی دے اج گلے میرے کوئی لگدا ئی

بیلے کے خارزار میں چاہنے والوں کو جنّتِ عدن مل گئی۔ وہ شباب اور پیار کے ریلے میں بہہ گئے۔ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ انھوں نے اپنی پیار کی دنیا سب سے الگ بسا لی جس میں سوائے محبوب کے کوئی بار نہیں پا سکتا۔ جس میں معاشرے کی رسموں اور پابندیوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس میں حرص و غرض کے بجائے ایثارِ نفس کارفرما ہوتا ہے لیکن ایسے سماج میں جہاں ہر بات کو سُود و زیاں کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے جہاں حسن و شباب بھی جنسِ بازاری بن جاتے ہیں۔ جہاں ذاتی املاک کا تصوّر سچّی محبت، خلوص، بے نفسی اور خود فراموشی کا استیصال کر دیتا ہے عُشّاقِ صادق پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی ہیں وہ پیار سے سماج کی آہنی گرفت کو توڑ چھوڑ دیتے ہیں۔ جس کیلئے سماج اُنھیں کبھی معاف نہیں کرتا۔ سماج میں ننگ و ناموس کے نام پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے مرد عورتوں کو بالجبر بیاہ دیا جاتا ہے اور پیار کرنے والوں کی راہ میں سنگین دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ہیر کا نکاح ایک بڈھے کھوسٹ سے جابر

ہے لیکن اسے اپنے منسوب و محبوب سے بیاہنا باعثِ ننگ و عار ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جونہی
لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ فلاں نوجوان اور لڑکی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو
اُن کے خلاف ہر طرف نفرت اور غُصّے کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور اُنھیں ایک دوسرے سے
جدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس نفرت کی تہہ میں ذاتی محرومی کا تلخ احساس کارفرما ہوتا ہے
جو عُشاق کے خلاف حسد اور جلن کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ مرد اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ آخر اس
لونڈے میں کیا خوبی ہے کہ ایسی خوش شکل لڑکی اس سے پیار کرتی ہے۔ عورتیں سٹپٹا جاتی ہیں کہ ہم
اس لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہیں اس نگوڑی میں کون سے چار چاند لگے ہیں کہ ایسا وجیہہ نوجوان
اس پر جان چھڑکتا ہے۔ ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ چاہنے والوں نے آپس میں پیار کر کے مجھے نظر
انداز کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ جو مرد عورتیں بے کیف ازدواجی گذار رہے ہوتے ہیں انھیں
یہ بات کھٹکتی ہے کہ چاہنے والوں کو پیار میں وہ خوشی کیوں میسر آ جائے جس کے لئے وہ عمر بھر ترستے
رہے ہیں۔ سیمون دی بووا نے[1] اس بات کی توجیہہ کی ہے کہ صدیوں کی غلامی سے عورتوں میں یہ
احساس محکم ہو گیا ہے کہ انھیں اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کرنے کا معاوضہ ملنا چاہیئے چاہے
وہ شوہر عمر بھر کے لئے ادا کرے یا تماش بین ایک ساعت کے لئے۔ جب وہ دیکھتی ہیں کہ
کوئی عورت محض پیار کی خاطر اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کر دیتی ہے تو وہ سمجھتی ہیں کہ اُس نے
ساری ملتِ نسواں سے غدّاری کی ہے۔ اس طرح وہ تمام عورتوں کی قدر و قیمت گھٹا دینا چاہتی
ہے لہذا گردن زدنی ہے۔ چنانچہ دوسرے عشاق صادق کی طرح ہیر اور رانجھے کو بھی پیار کا تاوان
غم والم، حسرت و ارمان، سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کی صورت میں دینا پڑا۔ جب ہیر نے سُنا کہ
کیدو کے اُکسانے پر اس کے ماں باپ اسے سیدے سے بیاہ رہے ہیں تو وہ غم سے نڈھال
ہو گئی۔ کیا وہ اس صریح ظلم کے آگے جُھک جائے گی۔ کیٔ دوسری عورتوں کی طرح اپنے ہاتھوں اپنے
پیار کا گھونٹ دے گی اور ساری زندگی ایسے شخص کے بچے جننے میں بتا دے گی جس کے چھونے

---

1 The Second Sex

ہی سے اسے گھن آتی ہے۔ یا وہ اس جبر کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو گی۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ان حالات میں لاڈلے بچّوں کی خُود سری اور ہٹ دھرمی ثابت قدمی کی صورت اختیار کر لیتی ہیر نے اپنی ماں اور بھائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں رانجھے کو دغا نہیں دوں گی۔ یاد رہے کہ چوچک نے رانجھے سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ ایک معیّنہ مدّت تک اس کے ڈھور ڈنگر چرائے گا تو ہیر اسے بیاہ دی جائے گی۔ ہیر اب تک اسی خیال میں مگن تھی کہ رانجھے سے میرا بیاہ طے ہو چکا ہے۔ اس لئے وہ کُھلّم کُھلّا اس سے پیار کرتی تھی۔ لڑکیاں دل ہی دل میں اپنے ہونے والے دولہا سے۔ اگر وہ ان کی پسند کا ہو۔ پیار کرنے لگتی ہیں اور اسے اپنے خوابوں میں بسا لیتی ہیں۔ ہیر نے ماں کی سرزنش کا جواب تُرکی بہ تُرکی دیا۔ اس کے اندر وہ لاڈلی اور سرکش لڑکی جسے عشق نے عاجزی اور دردمندی کا سبق دیا تھا۔ پھر سے جاگ اُٹھی۔ اس نے ماں سے کہا ؎

رانجھے نال لے قول قرار کیتا تو لوں پھراں تے ہوواں مَردُود بے نی
میتاں رانجھے نوں چھیڈاں نہ مول مائے جچر جان وِچ جسم موجود بے نی

ماں سے کہتی ہے مائیں تو بیٹیوں کی غم خوار ہوتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ گلولنی کی طرح بے رحم ہو ؎

کر کے نال ایمان اقرار پہلے نیّت بدل کے ہُن کیوں ڈولنی ایں
ماواں دِھیاں دیاں ہوندیاں درد خواہاں اِک تُوں بیدرد گلولنی ایں

ہیر تڑپتی رہ گئی اور کھیڑوں کی بارات باجوں گاجوں کے ساتھ آن پہنچی۔ ایسے موقعوں پر ہمارے دیہات میں نوجوان اپنی محبوبہ کو بھگا لے جاتا ہے۔ ہیر نے رانجھے سے کہا بھی کہ آؤ دونوں تخت ہزارے بھاگ جائیں۔ مجھے رسوائی کی پروا نہیں۔ میں غم کے مارے ساری رات نہیں سو سکی اور میری حالت اس کونج جیسی ہے جسے باز کے حوالے کیا جا رہا ہو ؎

باز ہتھ دو اڑے کونج شوہدی سانوں شرم دی ماپیاں پائی پھاہی
میرا وس نہ چلدا مول ایتھے جنج ہوئی ہے بیجی بیچ گئی وائی
تیری جان دی اساں نوں قسم بیبا مینوں رات نوں مول نہ نیند آئی

چل اُٹھ ہزارے نوں نس جائیے بھانویں جگ وِچ ہوئے رسوائی

رانجھا نہ مانا۔ لیکن آخری تدبیر ابھی باقی تھی۔ ہیر جانتی تھی کہ جب تک اپنی رضا مندی کا اظہار نہ کرے، شرع کی رُو سے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ جب قاضی ایجاب وقبول کے لئے آیا تو اس نے نکاح سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن قاضی نے چوچک سے مل کر اس کی رضامندی کے بغیر نکاح پڑھ دیا اور عورتوں نے دھکیل کر اسے پالکی میں بٹھا دیا۔ اس مجبوری کے عالم میں بھی ہیر کے عزم واستقلال میں فرق نہ آیا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ سسرال والوں کو جی بھر کے رسوا کروں گی اور سیدے کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دوں گی۔ ؎

نال ساہوریاں اساں اجوڑ کر کے گل گل اندر اوہناں بھنڈ نائیں

میلی نظر تکّے جیکر میاں سَیدا ڈھنگ داتری او سنوں چھنڈ نائیں

یہی عہد رانجھے سے بھی کیا ؎

مینوں بابلے دی قسم رانجھیا وے مَرے ماں جے تدھ تھیں مکھ موڑاں

تیرے باجھ طعام حرام مینوں تُدھ باجھ نہ نین نہ انگ جوڑاں

ایسی مجبوری کی حالت میں عام طور سے عورتیں راضی برضا ہو کر صبر کر لیتی ہیں لیکن ہیر تو ہیر تھی اُس نے اپنی کشمکش جاری رکھی۔ اُس نے سسرال سے رانجھے کو کہلا بھیجا کہ جوگی کا بھیس بدل کر آؤ اور مجھ سے ملو۔ جب رانجھا رنگ پور پہنچ گیا تو سہتی سے مل کر سازش کی اور رانجھے کے ساتھ بھاگ گئی۔

ہیر، وارث شاہ کا سب سے جاندار کردار ہے۔ وہ شروع سے آخر تک داستان پر چھا گئی ہے۔ وہ دوسرے رُومانی نسوانی کرداروں سوہنی، اروسی، کوراں، سسی، دمینتی وغیرہ سے مختلف ہے۔ بے شک یہ سب ایثار وعطا کی پتلیاں تھیں لیکن ہیر کے کردار میں جو شکوہ، دبدبہ اور طنطنہ ہے وہ ان میں دکھائی نہیں دیتا۔ ہیر بڑی سے بڑی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتی اور نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اس میں دیس پنجاب کی دیہاتی عورت کی سمجھ بوجھ اور ہوش مندی ہے۔ جو

صرف بھوری مٹی سے وابستہ رہنے والوں کو میسر آتی ہے۔ اس کی ہوشمندی کا ایک دلچسپ ثبوت اس وقت ملتا ہے جب وہ پیار دلاسے سے اپنی روٹھی ہوئی نند سہتی کو منا لیتی ہے اور اُسے سازش میں شریک کر لیتی ہے۔ سہتی جیسی اُلٹی کھوپڑی اور بے ڈھب عورت کو منانے کے لئے ہیر کہتی ہے ؎

ہیر دھیر کر کے آئی کول سہتی مونھوں آکھدی میری اُپتّے نی
مونھ جوڑ کے اوسدے نال مونھ دے کرے گل اک گھن کے پیتّے نی
نال بہت پیار دے موہ کے تے آکھے سائیں پیار دیئے بھیتیے نی
مہربان ہو کے چت نرم کر کے ساڈے نال توں پا بھر پتّے نی

ہیر کی ٹھوس حقیقت پسندی اس وقت آشکار ہوتی ہے جب وہ سہتی سے کہتی ہے کہ حسن و جوانی چار دن کے مہمان ہیں۔ کیوں نہ میں اور تم مل کر اپنے اپنے دوستوں کے وصال سے شاد کام ہوں۔ کب تک فراق کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ ؎

ایہہ جوبنا ٹھگ بازار دیائی سر کے محبوب دے تھیپئے نی
کاہنوں پیاں ترسایئے سجناں نوں کاہنوں آپ وِچ ہجر تڑپیئے نی
کر کے کوششاں سجناں نال ملئے جھٹ ہجر فراق دی کٹیئے نی
مل کے سجناں نال نجات پایئے الویں کا سنوں پیئے کلپیئے نی

وہ شیرنی کی طرح دلیر اور بے باک ہے۔ جب کیدو رانجھے کو دھوکا دے کر چوری لے جاتا ہے تو وہ اس سے چوری چھین لینے کے لئے جھپٹ کر آتی ہے ؎

ملی راہ وِچ دوڑ کے جا ڈھی پہلے نال فریب دے چھڈیا سو
نیڑے آن کے شیہنی وانگ گجی اکھیں روہ دا نیر بلیٹیا سو

جب اس کے پیار کا راز فاش ہو گیا اور لوگ طعنے دینے لگے تو ہیر نے بے باکی سے کہا ؎

خلقت جگ اُلاہنڑے بہت دیسی نہیں احمقاں تھیں بھلا مول مُڑنا

دینا جان کے سیس وچ ادکھلی دے اتے دھکلاں توں پھر کیہا ڈرناں

جاہل عاشقاں نوں ایویں دین طعنے جیویں کلب کملے لگّے مگر ہرناں

وارث شاہ اک رب دی مہر باجھوں ناہیں عاشقاں آسرا ہو پرناں

ہیر مہر و وفا کی پتلی ہے اس کا عشق سرزمینِ پنجاب میں ضرب المثل بن چکا ہے بقول وارث شاہ

عشق سیالاں دی زمین دے وچ آگیا افضل عشق سب بھتیں ہتی ہیر دائی

وہ سراپا اخلاص ہے۔ محبت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ وہ بڑی بے رحمی سے سماج کی ریاکاری کا پردہ چاک کرتی ہے اور کٹھ ملاؤں کی دکان آرائی کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑتی ہے۔ نام و ناموس کے بتوں کو پاش پاش کر دیتی ہے اور ثابت کر دکھاتی ہے کہ نیکی سماج کے جامد رسم و رواج کی پابندی سے حاصل نہیں ہوتی خلوص اور پیار سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں جو شخص سچا پیار کرتا ہے وہ کوئی برائی کر ہی نہیں سکتا۔ عشق انسان کے ذہن و قلب سے خود غرضی کی پھپھوندی کو دور کر کے اسے سچی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ہیر دیس پنجاب کی انٹی گونی ہے۔ انٹی گونی شاہ ایڈیپس کی بیٹی تھی۔ جس نے اپنے نابینا باپ کا آخر تک ساتھ دیا تھا۔ جب کریون نے تھیبس فتح کر کے انٹی گونی کے بھائی پولی نیسس کو قتل کر دیا تو یہ حکم دیا کہ پولی نیسس کی لاش گھوڑے پر ڈال دی جائے اور کوئی اسے دفن نہ کرنے پائے جو ایسا کرے گا موت کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ انٹی گونی نے اس جابرانہ حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے بھائی کی لاش بڑے احترام سے دفن کی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اس وقت سے انٹی گونی عورت کی بغاوت کی علامت بن گئی ہے۔ کیونکہ اُس نے جان پر کھیل کر مرد کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا تھا۔ ہیر کا کردار انٹی گونی کی طرح جدید عورت کے لئے تحریک و فیضان کا باعث بنا رہے گا۔ بیسویں صدی کی جو عورتیں مرد کی غلامی سے نجات پانے کے لئے جدّ و جہد کر رہی ہیں ہیر ان کی پیش رَو ہے۔ وہ برملا کہتی ہے کہ مجھے بھی خوش رہنے کا حق حاصل ہے اپنی پسند کے مرد سے پیار کرنے

لے شاہ ایڈیپس از سوفوکلیز

کا حق حاصل ہے۔ اپنے محبوب سے فیض یاب ہونے کا حق حاصل ہے۔ ہیر کا کردار جدید عورت کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ جب عورت اپنا کھویا ہوا مقام پالے گی، اس وقت ہیر کے کردار کی اصل عظمت آشکار ہو گی۔

رانجھا : دھیدو عرف رانجھا اپنے باپ چوہدری موجو کا محبوب بیٹا تھا۔ جس کے باعث رانجھے کے بھائی اس سے نفرت کرتے تھے اور اُسے ایذا پہنچانے کے درپے تھے۔ ؎

باپ کرے پیار تے وِیر بھائی ڈر باپ دے بھَیں پئے سنگدے نیں
مِہنے مار کے کُجھڑے سپ وانگوں اوہدے کالجے نوں پئے ڈنگدے نیں
کائی گل جے کرے تے وچ بھابیاں اوہدی گل نوں چا النگدے نیں
یا تیوڑیاں متھے تے گل کردے بولن بول اَوَلڑے جنگدے نیں

لاڈلے نوجوانوں کی طرح رانجھا بھی کھیتی باڑی کے کام سے جی چُراتا تھا۔ سر کے پٹے مکھن سے چپڑ کر ریشمیں چیرا باندھے گلی کوچوں کے چکر لگایا کرتا تھا یا درختوں کے نیچے بیٹھ کر ونجھلی بجایا کرتا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں اور بھابیوں کی زبانیں کھُل گئیں۔ بھابی نے کہا ؎

ٹھکھیلیا اہلی دیوانیا وے کتکاں سوہڈیاں دے اُتوں سُٹنا ئیں
چیرا ابتھ کے بھینڑے وال چوپڑ وچ ترنجناں پھیریاں گھتنا ئیں

بھائی بولا ؎

مُنہ چنڈ جو آرسی نال دیکھیں تینہاں ڈھنگ کیا ہل واہنا ئی
ہِنڈا پال کے چوپڑے پٹے جنہاں کسے رن کی اوسنوں چاہنا ئی

کہتا ہے جو مرد تن آسان ہو اور ہر وقت اپنے سنگار میں کھویا رہے عورتیں اس سے پیار نہیں کرتیں۔ یہ اس کی بھول تھی نوخیز لڑکیاں رانجھے جیسے چھیلے البیلوں پر مرتی ہیں۔ جیسا کہ رانجھے کی بھابی کو معلوم تھا۔ ؎

لشکندڑا دیہڑیاں وچ پھردا رناں ہنڈدیاں تدھ بھرمایاں نے

سانوں چھڈیا، کہتے نہ بہن جوگا لیکھاں نچ کے اساں نوں لایاں نے

بھابی نے طنزاً کہا کہ بیکار رہنے اور چنگا چوکھا کھانے سے رانجھا مستی کا شکار ہو گیا تھا ۔

کریں آکڑاں کھا کے دُدھ چاول ایہہ رج کے کھانے دیاں مستیاں نے
جھڑے آکڑے بکرے وانگ بوبو اوڑک ویکھیاں اُنھاں نے پستیاں نے

ایک بھائی نے کہا ۔

ویرے میٹھ واہڑ گذار دیندا اساں واہی دے وچ ایہہ بھاہنا نی
گلیاں ویہڑیاں دیو چہ لٹے بھوندا جیویں پھرے کوئی چھلی راہنائی

رانجھا نہایت خوبصورت جوان تھا اور غالباً اسی لئے اپنے بھائیوں کا محسود تھا ۔ اپنی خوبصورتی کے باعث جہاں بھی جاتا عورتیں اس پر لٹو ہو جاتیں ۔ رنگ پور کی عورتوں نے اسے دیکھا تو بے اختیار کہنے لگیں ۔

سوہنا پھُل گلاب معشوق ڈھا راجپوت تے سگھڑ سجان ہے نی
دھن ماں سُہاگن جنے جیاں کوئی حسن خزانے دی کان ہے نی

ایک بولی ۔

خونی بانکیاں نیشے دے نال بھریاں اکھیں کھیوایاں ساگ چڑھایاں نے
جھاں سوہنیاں چھیل اس نڈھڑے نوں جیویں چند اُتے گھٹاں چھایاں نے

جو کوئی اسے دیکھتا اسے یقین ہو جاتا کہ یہ کسی سردار کا بیٹا ہے ۔

سوہنا خوبصورت کوئی چھیل نڈھا پیا جاپدا پُت سردار ہیرے
اُگے نہیں ڈٹھا ایہدے وانگ جوگی نرم طبع تے نرم گفتار ہیرے

اور تو اور بالناتھ بھی اس کا حُسن و جمال دیکھ کر حیران رہ گیا اور غالباً اسی لئے رانجھے کو سب سے پہلے جوگ دے دیا ۔ سچ ہے کہ حُسن خاموش سفارش ہوتا ہے ۔

ناتھ ویکھ کے بہت ملوک چنچل اہل طبع تے چوکھڑا چھیل منڈا

کوئی حسن دی کان اشناک سندر حاکم جا پڑائی قلعہ گولکنڈا

لُڈن ملاح کی عورتیں رانجھے کے پاؤں دابنے لگیں اور لُڈن افسوس کرنے لگا کہ میں نے اسے پار کیوں نہیں اتارا۔ یہ تو میری عورتوں کو بہکائے گا۔ ؎

لُڈن ناہ لنگھایا پار اُسنوں اس ویلڑے نوں پچھوں تاوندائی
یارو جھوٹھ نکرے تے خدا سچا رناں میریاں ایہہ کھسکاوندائی

یہ بگڑا ہوا لاڈلا نوجوان بھائیوں بھابیوں کے طعنے سُن سُن کر گھر سے بیزار ہو گیا۔ ایک دن بھابی کو کھری کھری سنائیں اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ؎

منہ بُرا دسینڈا بھابھے نی ڈیلا اکھ دا بہئی بھگارنی ایں
جھوٹی بوُسری وانگ اڑاکے تے ناساں ٹڈکے نک اُبھارنی ایں

رات مسجد میں گذاری تو وہاں کے مُلاّ سے جھڑپ ہو گئی۔ رانجھا اسے کہنے لگا۔ ؎

داہڑی شیخ دی عمل شیطان والے کیہا راہیو راہیاں جاندیاں نوں
چہرہ نوری تے متھے محراب میاں کیوں بولیوں کفر اگاہیاں نوں

ان باتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ ہیر سے ملنے سے پہلے رانجھا ایک خودسر نوجوان تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ عورتوں کا دل موہ لینے میں طاق تھا۔ جب بھابی نے طعنہ دیا کہ ایسے ہی چھیلے بنتے ہو تو ہیر سیال بیاہ لاؤ، تو وہ نہایت اعتماد کے ساتھ جھنگ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنی مردانہ کشش پر پورا بھروسہ تھا۔ جب ہیر سے اس کا آمنا سامنا ہوا تو وہ اس کے حسن کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور اسے دل دے بیٹھا۔ لیکن یہ شکست فتح کا پیش خیمہ تھی۔ یہ معلوم کرکے اسے چنداں حیرت نہیں ہوئی کہ ہیر بھی اس پر فریفتہ ہو گئی ہے۔

رانجھے کی زندگی کا دوسرا اہم مرحلہ وہ ہے جب وہ چوچک کے ڈھور ڈنگر چرانے پر مامور ہوا۔ پنجاب کے دیہات میں ایسے چاک یا چاکر کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عام طور سے وہ لوگ دوسروں کے ڈھور ڈنگر چراتے ہیں جو قلاش ہوتے ہیں اور جن کی املاک نہیں

ہوتی۔ ایک معزز چوہدری کے بیٹے کے لئے کسی کے گھر چاکر بن کر رہنا باعث ننگ وعار سمجھا جاتا ہے۔ رانجھے کی ذاتی سیر حاصل املاک تھی۔ جسے اس نے محض تن آسانی کے باعث چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ ہیر کی خاطر ڈھور چرانے لگا۔ ملکی اور کیدو اس کا ذکر نہایت حقارت سے کرتے ہیں۔ اور یہ بات ہیر کی رسوائی کا باعث بن جاتی ہے کہ وہ ایک چاکر سے پیار کرتی ہے اور اس سے ملنے بیلے کو جاتی ہے۔ ؎

فتنہ ہوئی ایہہ گل وچ شہر سارے ہیر دوستی چاک دے نال لائی

بیلے جاوندی یار ہنڈاوَنے نوں جگوں شرم حیا نہ کرے کائی

چنانچہ رانجھا شدید احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ اس احساس نے اس کی حوصلہ مندی اور بے باکی کو سلب کر لیا۔ ہر طرف سے طعنوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی اور ہر کوئی اسے حقیر و ذلیل سمجھنے لگا۔ کیدو کے اُکسانے پر چوچک نے ہیر کی منگنی سیدے کھیڑے سے کر دی تو ہیر نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ لیکن رانجھے نے چوچک سے کہا تو یہی کہا کہ تم نے ہیر کا لالچ دے کر مجھ سے خدمت کروائی ہے۔ ہیر تو تیرے گھر ہی رہی اور مجھ سے محنت کی بیگار لی۔ جیسے بنیا سُود لیتا رہتا ہے اور اس کا اصل زر بحال رہتا ہے۔ ؎

دُہی کھتری دی رہی کھتری نتے ڈُوہ گیا لیکھا کاڑ کاڑ میاں

تیری دِھی رہی تیرے گھر بیٹھی جھاڑا محنت دا لیائی جھاڑ میاں

طمع ہیر دا دیکے ٹھگیوئی پچھوں بھنیوں خوب پھاڑ میاں

مینوں آکھدا سئیں گھر بار تیرا ویکھیں اج نہ اکھ اُکھاڑ میاں

لیکن اس قسم کی دلیلیں تو وہی دیتے ہیں جو کمزور اور کوتاہ ہمت ہوں۔ پنجاب کے دیہات کا دستور ہے کہ اگر کسی کی منگیتر کوئی دوسرا بیاہ کر لے جائے تو غیور و جسور جاٹ جان پر کھیل جاتے ہیں مارتے ہیں اور مر جاتے ہیں عیالی نے رانجھے کو یہی طعنہ دیا تھا کہ تمہاری منگیتر دوسرے بیاہ کر لے گئے اور تم چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے تم میں غیرت ہوتی تو ڈوب مرتے یا ہیر کو بھگا لے جاتا

تھا یا اس کے دروازے پر لڑ مرنا تھا۔ یہ بوجھ تمھاری سکت سے زیادہ تھا تو اٹھایا کیوں تھا۔ ہیر کو جان سے مار دیتے یا خود مر جاتے۔ تمھاری منگیتر سیدا کھیڑا بیاہ کر لے گیا۔ اس کے بعد تجھے پنچایت کے سامنے اپنی داڑھی منڈوا دینی چاہیے تھی۔

ہُن ہیر گوا ئیکے ہیریا او پیا رونا ئیں اسرا ئیل وانگوں
ایس غیرتوں جے کدے ڈُب مردوں نک ڈوب کے مرد اصیل وانگوں

پھر کہتا ہے ؎

لیکے ہیر تائیں کتے ٹھہ جاندوں ایڈی، دھم کی موُر کھا پاوُنی سی
مرجاونا سی دریار دے تے مُڈھوں سمجھ کے پنڈا ایہہ جاوُنی سی
اِکّے ہیر ای مار مکاوُنی سی اِکّے اپنی جان گواوُنی سی
وارث شاہ جاں منگ لے گئے کھیڑے داڑھی پرہے دیوچ مناوُنی سی

رانجھا اصیل تھا لیکن چاکری کی ذلت نے اسے غیرت اور مردانگی سے عاری کر دیا تھا۔ ہیر کا بیاہ سیدے سے رچایا گیا تو اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔ طاقتور کمزوروں کے رشتے چھین لیتے ہیں۔ دُھبے قسمی میں مُردہ سانپ کی طرح اندر ہی اندر وِس گھولتے رہتے ہیں اور اسی کشمکش و تذبذب میں رہتے ہیں کہ ماریں یا مر جائیں۔ ؎

ساک ماڑیاں دے ڈاہڈے کھوہ لیندے اَن ڈِٹھے مُنہ نہ کھولدے نے
وِس چلے نہ مول نتانیاں دا موئے سپ وانگوں وِس گھولدے نے
کدی آکھدے ماریئے آپ مریئے پئے اندروں باہروں ڈولدے نے
گُن ماڑیاں دے سبھے رہن وِچے ماڑے ماڑیاں تے دُکھ پھولدے نے

رانجھا گومگو کے عالم میں رہا اور ہیملٹ کی طرح کوئی راہِ عمل متعین نہ کر سکا۔ اس کے اندر کا غیور جاٹ بار بار اسے کہتا رہا کہ مارو یا مر جاؤ۔ لیکن جب اس نے اپنے آپ کو ماڑا اور نتانا تسلیم کر لیا تو اقدام کی جرأت و مبادرت کہاں سے آتی۔ شادی کے موقع پر ہیر پر احسان دھرتے

ہوئے کہنے لگا کہ تیرے پیار کی خاطر میں نے سب مصائب برداشت کئے ہیں اور لوگوں کے طعنے سُنے ہیں ؂

بچھے مجھیں دے رات دن پھر دیاں دے پیراں نازکاں دیوچ پئے چھالے
میری جان تے جگر نوں ڈنگ گئے تیرے زہر والے گیسو ناگ کالے
سڑکے عشق دی اگ بھیں بھسم ہویا اجے برہوں الُنبڑے ہت بالے
وارث لا کے نیہوں حیران ہویا لگدے طعنیاں دے سانوں تیز بھالے

ہیر نے رانجھے سے کہا آؤ بھاگ چلیں لیکن رانجھے نے سُنی اَن سُنی کر دی اور عورتوں کی طرح اُلٹا طعنے مہنے دینے لگا ؂

جے کر پیار دی چاہ نہ ہووے اندر اویں کاسنوں کھوہے نوں گیڑئیے نی
ثابت ہو کے عشق تے قائم رہیئے دامن ناہ آکو دبیڑئیے نی
جنیاں منتروں کیلناں نہ آوے مُتے ناگ نہ مول وریڑئیے نی
وارث شاہ پیاس نہ ہووے اندر شیشے شربتاں دے ناہیں چھیڑئیے نی

کوتاہ ہمت لوگوں کا شیوہ ہے کہ وہ اپنے قصور کا الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ ہیر کی ثابت قدمی اور پاس وفا کا یہ عالم ہے کہ وہ ماں باپ کی عزت و حرمت کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہے اور رانجھے کو اسے لے جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ متردد خود ہے اور طعنہ ہیر کو دیتا ہے کہ ثابت قدم نہیں رہنا تھا تو پیار کیوں کیا تھا اور ہیر ہی کو الزام دیتا ہے کہ میں نے تیرے لئے چاکری کی لیکن تو میری پروا نہیں کرتی اور سیدے جیسے بڈھے کھوسٹ کے ساتھ سر جوڑ لیا ہے ؂

خاطر تے نہ اساں نوں اج لیاویں ہوئے چاک بھی بدل کے بھیس اڑیئے
بڈھے کھیڑے دے نال سر جوڑیائی ہو کے بالڑی عمر دریس اڑیئے

یہ زیادتی ہے۔ ہیر نے تو نکاح سے انکار کر دیا تھا اور قاضی جی نے جھوٹ موٹ کا نکاح

پڑھ دیا تھا۔

سسرال جانے کے بعد ہیر نے رانجھے کو پیغام بھیجا کہ جوگی کا بھیس بدل کر آؤ اور مجھ سے ملو۔ یہ سنتے ہی رانجھا ٹلہ جوگیاں کی طرف چل پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہیر اسے قدم قدم پر سہارا دیتی رہی ہیر نے بلا بھیجا تو وہ ہر قربانی دینے پر مستعد ہو گیا۔ جوگ کی تیاری کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

کنگھی وانگ ہن چیر کے آپ تائیں ذرا زلف محبوب دی واہ لیئے
اگے جھنگ سیالاں دا سیر کیتا جھوک کھیڑیاں وَل جھکا لیئے

ایک چھیل چھبیلے کے لئے اس سے بڑی قربانی کیا ہو سکتی تھی کہ بالائی سے پالے ہوئے پٹے منڈوا دیتا اور کانوں سے سونے کے بُندے اُتار کر انھیں مندریں ڈالنے کے لئے پھڑوا دیتا۔ ؎

پٹے وال ملایاں دے نال پالے وقت آیا سو رگڑ منا دتے دا
بُندے سونے دے لاہکے چا چڑھیا کن پاڑ کے مندراں پا دتے دا

اب وہ آزاد تھا، چاکری کی ذلت سے آزاد۔ چاکری سے آزادی ملی تو اس پر اپنی ذات کا انکشاف ہوا۔ اس کی حوصلہ مندی، جرأت اور شہامت عود کر آئی۔ اب وہ چاکر اور مارا نہیں تھا جس کی منگیتر کھیڑے بیاہ کر لے گئے تھے اور وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ اب ایک مردِ آزاد تھا۔ جس نے اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ اب دوبارہ اُسکو اپنے چودھری ہونے کا احساس ہونے لگا۔ جب گرو بالناتھ نے اسے کہا کہ دیکھو کبھی جوان عورت کی طرف نگاہ نہ کرنا اور عورت ذات سے بچ کر رہنا تو رانجھا بولا مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تو مجھے پیار کرنے سے منع کرے گا تو میں تخت ہزارے کا چودھری ہو کر کان کیوں پھڑواتا اور بدن پر بھبوت کیوں ملتا ؎

جے ہیں جاندا عشق تھیں منع کرنا تیرے ٹلے تے دھار نہ دھاروائیں
کاہنوں کن پڑوائیکے سواہ ملدا ہو کے چودھری تخت ہزار دائیں

اس کے ساتھ اس کے آغازِ شباب کا لاابالیانہ پن بھی بحال ہو گیا اور اس نے گرو سے صاف صاف کہہ دیا کہ ناتھ جی! آپ کی یہ نصیحت تو میرے جی کو نہیں لگی کہ عورت کے قریب

نہ پھٹکتا ہے

تیری پند پسند نہ اساں نا تھا رکھ اندرے ہی بھاری ٹھوکڑی نوں
تیری مت دی اساں نہ لوڑ کائی کا نوں اُگریں پیا پھوکڑی نوں
اساں بدھی نوں ماں ای جانناں ای رن جانسائی چھوٹی چھوکڑی نوں
جیہنے نفر آوے کوئی رن موٹی ناہیں چھڈناں کلیاں ٹھوکڑی نوں

یہ سُن کر بالناتھ افسوس کرنے لگا کہ میں نے کیسے غلط آدمی کو جوگ دے دیا اور رانجھے سے کہنے لگا تم نے مجھے دھوکا دیا ہے ۔

پچھوں تاوناں ہاں کیتی مورکھی نوں ملکھیں ہتھ نہ آوندا اوہ ویلا
کنیں ایسدے مندراں پا بیٹھا ہو یا ٹھگ دا آن کے ایہہ میلا

رانجھا کہتا ہے کہ یہ جاٹ بڑے مکار ہوتے ہیں اور مطلب براری کے لئے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ ہٹ کے بھی پکے ہوتے ہیں۔ اب میں سیدھا رنگ پور جاؤں گا اور سیالوں اور کھیڑوں کی ناک اُسترے سے رگڑ کر کاٹوں گا۔ ۔

اسیں جٹ ہاں مطلبی یار پورے داؤ ڈھنگ کر کے دیلا کڈھناں ای
بھاویں جان دا پیا نقصان ہووے ہٹ ڈھلے دا مول نہ چھڈناں ای
گرو پیر تے رب دا ناں لیکے جھنڈا جا وچ رنگ پور گڈناں ای
وارث نک سیالاں تے کھیڑیاں دا لیکے اُسترا گھر کے وڈھناں ای

اور جب وہ ٹیلے سے نیچے اُترا تو اس کے سینے میں انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی ۔

جویں سیدے نے ساڈیاں لباں لیاں سر اوسدا توریں میں مونڈناں ای
جویں کھیتیاں اُجیاں لین لا پر توریں سیتی دی گُت مروڑناں ای

اپنے مقصد کے حصول کے لئے وہ ہر قسم کا مکر و فریب کرنے کی تیاری کرتا ہے اور جھوٹ موٹ کا وید بن بیٹھتا ہے ۔

رانجھے تُردیاں ہویاں تجویز کیتی کوئی ہور فریب بنائیے جی
یٹ بُوٹیاں ڈُتے دیاں پا پگلی وچ رکھ کے جا سُنکا ئیے جی
درس یار پایئے وار کھینے نوں ویداں جوگیاں دا ویس لائیے جی
وارث یار دا تدوں دیدار پایئے جدوں اپنا آپ گوا لیئے جی

یہ جوگی وہ رانجھا نہیں تھا جسے چاکری نے کم ہمت اور بُزدل بنا دیا تھا۔ یہ وہ رانجھا تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ ہیر کو بیاہ لانے کے لئے گھر سے روانہ ہوا تھا۔ رنگ پور پہنچ کر اُس نے سہتی اور ساتھیل باندی کی خوب کندی کی۔ جب ہیر سانپ کے ڈسنے کا بہانہ کر کے بیمار ہوئی اور سیدا جوگی کو علاج کے لئے بلانے باغ میں گیا تو رانجھے نے مار مار کر اس کا بھُرکس نکال دیا۔ ہیر اور سہتی نے ایک ساتھ بھاگ جانے کا منصوبہ بنایا تو اب کے رانجھا متردد نہیں تھا بلکہ نہایت دیدہ دلیری سے اُسے لے بھاگا۔

رانجھے کے کردار کے مطالعے سے وارث شاہ کی نفسیاتی ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر عظیم شاعر اور تمثیل نگار کی طرح وارث شاہ بھی فطرتِ انسانی کے رمز شناس ہیں اور انسانی کردار پر جذباتی مجبوریوں اور خارجی ماحول کے اثرات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

کیدو : کیدو ہیر وارث شاہ کا وِلن ہے۔ وِلن کا کام بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ دو چاہنے والوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انھیں جُدا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات اس کا کردار اُس ناکام عاشق کا ہوتا ہے جو کسی حسینہ کی محبت کو جیتنے میں ناکام رہتا ہے اور اِس کا انتقام اُس شخص سے لیتا ہے جس سے وہ پیار کرتی ہے۔ اُس کا پیار نفرت میں اور خلوص کینے میں بدل جاتا ہے۔ وِلن کی ایک قسم زیادہ خبیث ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو محبت کرتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ان سے خدا واسطے کا بَیر رکھتے ہیں اور ان میں کھنڈت ڈال کر منفی تسکین محسوس کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ پہلو عجیب و غریب ہے کہ بعض لوگ جنھیں خوشی میسر نہیں آسکتی۔ وہ اُن لوگوں کو ناخوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جو مسرت سے بہرہ ور ہیں گویا وہ دوسروں کو خوشی سے محروم کر کے ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ ان کا حسد شیکسپیئر کے مشہور وِلن ایاگو کے بقول :

"وہ سبز چشم عفریت ہے جو اپنے شکار کو نگلتے وقت اس کا مذاق بھی اُڑاتا ہے"۔

اس حسد کی تہ میں ذاتی محرومی کا تلخ احساس کارفرما ہوتا ہے۔ سی ای ایم جوڈ نے کہا ہے:

"وہ مرد جو کوتاہ ہمتی کے باعث جنسی حظوظ سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے اور وہ عورتیں جو بدصورتی کے باعث کسی مرد کے لئے کشش کا سامان نہیں رکھتیں ان لوگوں کو بُرا بھلا کہنے میں پیش پیش ہوتے ہیں جو زیادہ باہمت اور زیادہ خوبصورت ہونے کے سبب حظ اندوز ہوتے ہیں۔"

کیدو اسی دوسری قسم کا وِلن ہے۔ وہ ایک بدصورت لنگڑا ہے۔ پنجابی دیہات کی ایک کہاوت ہے۔ "کانڑے تے لنگڑے دی اِک رگ ووَدھ ہوندی اے"۔ اسی لئے وہ ہمیشہ شرارت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ وارث شاہ کیدو کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

وارث شاہ میاں ویکھ ٹُنگ لنگی شیطان دی کلا جگاوندی اے

چالاں بھیڑیاں تیریاں لنگیا او محل جاڑھ کے پوڑیاں چاوناں میں

جس شخص میں کوئی ظاہری جسمانی نقص ہوتا ہے وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور نارمل آدمی کی طرح امن و عافیت سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کی کوشش دوگونہ ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنے جسمانی نقص کی طرف سے ہٹائے اور دوسرے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ یہ عذابِ دوگونہ اس کے اندرون میں نفسیاتی کشمکش کا باعث ہوتا ہے جو اُسے ساری دنیا کے خلاف برسرِپیکار ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ مثلاً جب کوئی کانا یا لنگڑا شرارت کرتا ہے تو لوگ اس کی شرارت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے اس کے کانے پن کو بھول جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بدصورتی کے سبب وہ جس کشش سے محروم ہوتا ہے اسے جذب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وارث شاہ نے کیدو کی کردار نگاری میں گہری نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ کیدو اپنے جسمانی نقص کا انتقام دوسروں سے لیتا ہے۔ اپنی محرومی کے باعث جب وہ کسی

لہ اخلاق کا مستقبل۔

لہ لائق کی فارسی مثنوی 'ہیر رانجھا' میں کیدو کو بجا طور پر "بلائے لعینا" کہا گیا ہے۔

کو پیار کرتے دیکھتا ہے تو حسد اور رشک سے جل بھن کر کباب ہو جاتا ہے۔ احساسِ کمتری نے اس کے جذبۂ حسد میں زہرناک تلخی پیدا کردی ہے اور لوگوں کی جذبِ توجہ کے لئے وہ ہمہ وقت شرارت پر آمادہ رہتا ہے۔ چوچک کے بقول وہ چوروں اُچکوں کا ساتھی ہے۔ فتنہ پرداز ہے۔ لگائی بجھائی اور اشتعال انگیزی کا ماہر ہے۔ ؎

چوچک آکھیا لنگیا! جاہ ایتھوں تینوں ول ہے جھگڑیاں جھیڑیاں دا
سرِ دھاڑیں چوراں اُچکیاں دا سوہا بیٹھا ہیں ساہویاں بیڑیاں دا
تیرے وسب نے سب معلوم سانوں لتھڑ وڈ ائیں لگ لبیڑیاں دا
آپے چور تے آپ ہی بنے کھوجی مال تاڑناں دور تے نیڑیاں دا
تینوں صلح سلوک دا ول ناہیں ول آوندا دکھ نکھیڑیاں دا
سدھا گیڑ دا کل جہان کھوہا تینوں ول ہے اُلٹیاں گیڑیاں دا
ہئیں عقل تینوں پاٹا سیونے دی جانے ول توں خوب اُدھیڑیاں دا
کامنوں کھوجیوں نال کنواریاں دے پایو مزہ بے دوساں نوں چھیڑیاں دا

ہیر بھی اپنے چچا کو خوب جانتی پہچانتی ہے۔ کہتی ہے ؎

جھوٹھی سچیاں گلاں نوں میلدا ای وانگ لاگیاں کوڑیاں نایاں دے جی
ذرا گل دی جا وڈ ھان کرسی مرچیاں لون دی چاٹ لگا ئیکے تے
ہیر آکھدی میرا چنڈال چاچا ہتھیں لاوندا پیریں بجھاوندائی

کیدو بھنگ پیتے اور ناچنے کا بھی شغل کرتا ہے ؎

ایہہ چغل جہان دا مگر لگا فقر جاندے ہو نال سیلیاں دے
کدی نال ملاریاں بھنگ گھوٹے کدی جا نچے نال تیلیاں دے

جیسا کہ لڑکیوں کی شکایت سے ظاہر ہے کیدو چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتا اور موقع ملے تو اپنی ہوس کی تسکین بھی کر لیتا ہے لیکن ریاکاروں کی طرح دوسروں کے اخلاق کا محافظ بن بیٹھتا

ہے۔ اور خاندانی ناموس کے نام پر ہیر اور رانجھے کے خلاف سازش کا جال پھیلاتا ہے۔ ہیر سے متعلق کہتا ہے ؎

چاک نال اکلڑی جائے بیلے اج، کل کوئی ٹھیک لگاوندائی

ہیر کی ماں ملکی سے کہتا ہے ؎

کیدو آکھدا دھی ویاہ ملکی دروہی رب دی مُن لے سائیں نی
اکے مار کے وڈھ کے کرس بیرے بسر متھ بھن نال چرائنے نی
ویکھ دھی دا لاڈ کی دُند کڈھیں انت جھوریں رنتے قضائنے نی
اکے بتھ کے تے بھورے چا گھتو لنب وانگ بھڑرے وٹے آئینے نی

جو سزائیں وہ ہیر کے لئے تجویز کرتا ہے ان سے اس کی ایذا رسانی آشکار ہو جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ لکڑی سے اس کا سر منھ توڑ دو۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے تہ خانے میں ڈال دو، اور باہر سے دروازہ بند کر دو۔

وارث شاہ نے کیدو کو بے رحم سماج کے جامد رسم و رواج کے محافظ کے بطور پیش کیا ہے۔ اور سماج کی اس کھوکھلی ریاکاری کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے خلوص و محبت کو کچلنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ریاکاری اور خلوص جذبہ کی کشمکش میں آخری فتح ریاکاری ہی کی ہوتی ہے کیدو ہیر کو زہر دے دیتا ہے۔ ہیر کو جان سے مار کر کیدو نے وہی اذیت پسندانہ شیطانی خوشی محسوس کی ہوگی۔ جو ایاگو نے ڈیسڈے مونا کے قتل پر محسوس کی تھی۔

سہتی : سہتی کا کردار وارث شاہ کی ایک اچھوتی تخلیق ہے۔ زندگی اور ادبیات میں بدمزاج اور تند خو عورتوں کی کمی نہیں۔ رتن ناتھ سرشار کی الف لیلہ میں مخمورہ اپنے شوہر معروف نوچی سے کبابوں کی فرمائش کرتی ہے :

"خدا سے یا نہ دے مجھے نہ خدا سے بحث ہے نہ روپے سے میں تو تم کو جانتی ہوں اور کسی کو نہیں پہچانتی ہوں۔ اگر نہ لائے تو تم جانو اور تمہارا کام تب مخمورہ میرا نام کہ تم سے ابھی بدلہ لوں

اور جہاں کے ہو وہیں پہنچاؤں۔ مرچی جاری ہو گیا اشک جاری ہو گیا۔ کہ آخر میں کہاں سے لاؤں لا
کس کے اس چوری کرتے جاؤں۔ اس پر مخورہ آگ بھبوکا ہو کے بولی ہٹ تیرے ٹوکا
لگاؤں۔ تیرا حلوہ کھاؤں اسے مردود ابھی لا کے دے نہیں تو تیری بوٹیاں نوچوں گی۔"
شاہ لیئر کی بیٹی گانیرل اپنے باپ کو وہ جلی کٹی سناتی ہے کہ وہ پاگل ہو جاتا ہے لیکن نشتر
زبان سہتی کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی زبان بچھو کے ڈنک سے بھی زیادہ زہریلی ہے اور جب
وہ چھڑ جاتی ہے تو شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔

شیطان نے آن سلام کیتا سہتی جھتیا تے اساں ہاریاں
افلاطون دی ریش مقراض کیتی وارث قدرتاں ویکھ کے واریاں

مکاری ایسی ہے کہ شیخ سعدی کے بھی کان کترتی ہے ؎

شیخ سعدی دے فلک نوں خبر ناہیں جیہا رو کے فند چلاوندی اے
تل ہیٹھ انگیار رکھائیکے تے اُتوں بہت پیار کراوندی اے

سہتی خود بھی فخر یہ کہتی ہے ؎

فیلسوف جہاں دیاں اسیں رناں اساں مکر دے جال وچھاؤنے وے

وہ دُکھتی رگ چھیڑنے اور زخم کُریدنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ جب رانجھے سے اس کی
تکرار ہوتی ہے تو اس کا ناک میں دم کر دیتی ہے۔ ؎

رجے سا ہن دا نگوں لُڈی مار ناہیں گائیں ویکھ جیوں ماردا بڑھک ہے وے
اگے کتاں نوں لیک لوایائی ہن نک نوں لیک لگاؤں گی وے
خشکی کھنگ مقیں ننگھ بھڑاوندائی اہدے وچ کلام نہ مٹھ ہے نی
تیری چڑا چڑ چھیڑ کدی جیبھ ایویں جیویں جھتیاں مُرکدیاں سایاں دیاں
اوہناں کھوتیاں نوں راتب کون دیندا جیہڑے کھان کوڑے گلھ نوڑیاں وے

سہتی جوگی سے کہتی ہے کہ مفت خوروں کی طرح لوگوں کے دروازوں میں جھانکتے پھرتے

ہو جیسے رشتہ کرانے والی مکار عورتیں گھر گھر پھرتی ہیں۔ چاہیئے تو یہ کہ تو محنت مشقت کر کے خود کماتے اور اپنی حلال کی کمائی سے دوسروں کو خیرات بھی دے۔ ؎

کر کے محنتاں کھا کھُوں ہتھوں پُن پوریاں نیک کمایاں دیاں
چسکے خور بوہے بوہے پھریں بھوندا پھِیے کٹنیاں جویں کُڑمایاں ڈیاں

جب سہتی غصے میں آجاتی ہے تو پھر وار طعنوں مہنوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے ؎

لونھڑا بوتھڑا سن منیا دے بکے سُنجے مکان دیا جندیا وے
ادھڑا بوجڑا کھنڈیا گُنڈیا وے سِدھی آری دیا ونگیا وندیا وے
مُونہوں اُوت گھتوتیاں واہ ناہیں ذرا ٹھاک زبان نوں گندیا وے
رناں وچ وھناں کیہا لیر بیٹھوں جھوٹے وانگ وچ میں ڈے کھنڈیا وے

رانجھا کچھ دیر تو اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے لیکن داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

باہروں کھوٹے اندروں لوٹئے نیں نال رمز دے سخن الاوندی ایں
سخن بڈھتیاں وانگ پکھنوٹ تیرے اکھیں نال بجھارتاں پاوندی ایں

اندازِ بیان کی طرفگی قابلِ لحاظ ہے۔ سہتی سے کہتا ہے کہ تو اپنی آنکھوں سے پہیلیاں بجھاتی ہے۔

سہتی سے جھگڑا کر کے رانجھے پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی ــــ یہ حقیقت تمام مردوں پر واضح ہو جانی چاہیئے ــــ کہ عورت سے بحث کرنا سراسر حماقت ہے۔ عورت کی منطق نرالی ہوتی ہے اور وہ بقول وارث شاہ افلاطون کی داڑھی بھی کتر لیتی ہے۔ سہتی نہایت بیباک اور تُند خُو ہے لیکن ساتھ ہی بڑی زیرک اور اداشناس بھی ہے۔ جب رانجھا جوگی بن کر آیا اور ہیر کو خبر ملی تو بناؤ سنگار کر کے اُس کا انتظار کرنے لگی۔ سہتی سوچنے لگی کہ خلافِ معمول یہ سنگار کس کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اور جب رانجھا ہیر کے سامنے آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا تو سہتی سب کچھ بھانپ گئی اور ہیر سے کہنے لگی ؎

کجل پوچھلا گھت کے وِچ نیناں زُلف کُنڈلاں دار بناوندی ایں

ربنیاں پٹیاں مُکھ پلما زُلفاں چھلّے گھت کے رنگ وٹاوندی ایں

ٹھوڈی گلھّ تے پا بیکے خال خونی راہ جاندڑے مرگ پھساوندی ایں

کِنہاں نخریاں نال بھرماوندی ایں اکھیں پا سُرمہ مٹکاوندی ایں

نواں ویس تے ویس بناوندی ایں چالاں پھیریاں نال گھمکاوندی ایں

چونک پا بیکے سر تے فتر والا تُوبُتاں یار نوں پئی دکھاوندی ایں

نال جوگی دے اکھیاں مار کے نی ساڈے نال توں پئی چمکاوندی ایں

نال جوگڑے دے تُوبُتاں بل گیوں اکھیں نہریاں نال بھرماوندی ایں

کیا خوب کہا ہے کہ جوگی سے آنکھیں لڑاتی ہو اور ہمیں آنکھیں دکھاتی ہو ۔

رانجھے نے ہیر کی طرف ذومعنی انداز سے دیکھا تو سہتی بولی کہ یہ جوگی تو آنکھوں میں چٹکی لیتا ہے

جو منڈیاں اکھیاں دے وِچ وَڈھ لیندا راز جاندا اکھ دی جھیت دائی

لیکن یہ تنک مزاج، منہ پھٹ، زبان دراز لڑکی عشق کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہو گئی۔ وہ مراد بلوچ سے پیار کرتی تھی اور اس کے فراق میں تڑپ رہی تھی۔ رانجھے نے اس سے کہا کہ میں تجھے مراد بلوچ سے ملا دوں گا۔ یہ سنتے ہی سہتی رام ہو گئی۔ اس کی تند خوئی عاجزی میں بدل گئی۔ اُس نے رانجھے کے آگے اپنی محبت کا اظہار کر کے اس سے استمداد کی ۔

آتش ہجر بلوچ دی جگر لُوٹھا کریں مہر سائیاں تتی مرنیاں میں

نال عاجزی عجز نیاز پیرا مُڑ مُڑ آکھنی ہاں تیری ہرنیاں میں

بھو رہی آں عشق دیو ہتھ کلی ہاوے خاص محبوب دے بھرنیاں میں

ایس عشق دے روگ تے ہڈ گالے لودی کندھ وانگوں وچوں کھُرنیاں میں

اب وہ رانجھے کو اپنا پیرو مرشد ماننے لگتی ہے اور کہتی ہے خدا کے لئے مجھے مراد سے ملا دو میں ہیر کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں ۔

ہُنّے سوہنی موہنی ہنس رانی ہرگ موہنی جا کے گھلّتی ہاں
تیریاں پیریاں غفلتاں ویکھ کے میں ماندی ہو کے گھرانوں چلنی ہاں
مینوں ملے مُراد تے جیونی ہاں کرو مہر تا میں ایتھوں ہلنی ہاں
مینوں میل مُراد تُوں بوجھ سایاں تیرے پیریں جھس کے ملنی ہاں

سہتی کے کردار میں وارث شاہ نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ پیار تیز مزاج، تند خُو اور لڑاکا عورتوں کو بھی "سدھا"ؔ لیتا ہے

چُوچک : ہیر کا باپ چُوچک بڑا جہاں دیدہ اور کائیاں جاٹ ہے۔ جب ہیر رانجھے کو چاکر رکھوانے کے لئے اس کے پاس لاتی ہے تو چوچک ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لڑکا ڈھور کیسے چرائے گا۔ اس کا بدن تو چھونے سے مَیلا ہوتا ہے۔ یہ تو کسی سردار کا بیٹا معلوم ہوتا ہے اور ماں باپ کا لاڈلا ہے۔ اس کے ہاتھ چنار کے پتے کی طرح نرم ہیں اور یہ محنت مشقت کا عادی نہیں ہے ؎

باپ ہس کے پچھیا کون ہندا ایہہ منڈا کسے سرکار دائی
ہتھ لایاں پنڈے تے داغ پیندا ایہہ نہیں دے نہیں کار دائی
جاپے لاڈلا باپ تے ماں سندا ایہدا طور جیویں شکھیار دائی
کرے ناز لڈکیاں سب گلاں پلیا ہویا ایہہ لاڈ پیار دائی
ایہدے ہتھ وچ گھاسیاں نہیں پیاں پنجہ ایہدا برگ چنار دائی
وارث شاہ دسے وانگ کمزور جاپے بہہ کے دہلیاں وقت گذار دائی

ہیر کے اصرار پر چوچک اسے چاک رکھ لیتا ہے اور اس سے عہد کرتا ہے کہ تو نے کچھ مدت ڈھور چرائے تو میں تجھے ہیر بیاہ دوں گا۔ جب ہیر اور رانجھے کے پیار کا راز فاش ہوتا ہے تو رانجھے

؎ اس لفظ کا استعمال شیکسپیئر کی Taming of the Shrew کی رعایت سے کیا گیا ہے۔ شیکسپیئر کی کیتھرینا کو وحشت زدہ کرکے سدھایا جاتا ہے جب کہ سہتی پیار کے سامنے سپر انداختہ ہے۔ سہتی کا کردار زیادہ جاندار ہے۔

کو سخت سرزنش کی جاتی ہے۔ رانجھا ڈھور چرانے سے انکار کر دیتا ہے۔ بھینسیں جو رانجھے کی ونجلی سے مانوس ہو چکی تھیں چرنا چھوڑ دیتی ہیں تو چوچک پریشان ہوتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اب بھینسوں کا کیا بنے گا۔ اگر رانجھا میری بیٹی سے پیار کرتا ہے تو کیا ہوا۔ پیار سے ہیر کا کیا بگڑ جائے گا۔ کیوں نہ مکر و فریب سے کام لے کر رانجھے سے خدمت کرائی جائے۔ وقت آنے پر ہیر کا بیاہ کہیں اور کر دیں گے اور اسے نکال باہر کریں گے۔ کہتا ہے۔

ایس جگ مکار دا کم ایہو کوئی مکر فریب بنائیے
ساڈی دھی دا کجھ نہ لاہ لیندا سبھا ٹہل ٹکور کرائیے
جدوں ہیر ڈولی پا ٹور دیئے اوس ویلے جواب تاں چا دئیے
وارث شاہ میاں جٹ سدا کھوٹے جٹکا فند ایتھے اک لائیے

وارث شاہ کہتے ہیں کہ جاٹ دغا باز ہوتے ہیں ان کا قول ناقابل اعتماد ہوتا ہے۔ پہلے رشتہ دیتے ہیں بعد میں توڑ دیتے ہیں اور الزام نائیوں پر دھرتے ہیں۔

دغا جٹ دا بڑا مشہور یارو اجے دین نہ مہیں چرایاں دا
یارو جٹ دا قول منظور ناہیں گوز شتر دا قول ستایاں دا
منہ آکھ گڑایاں کھوہ لیندے مونہہ کرن کالا پچھوں نائیاں دا
وارث شاہ ایہہ تیرے ہی جھوٹھ جانوں قول جٹ سنیار قصایاں دا

چوچک اپنے بھائی کیدو کی فتنہ پردازی سے پوری طرح آگاہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیدو کے بہکاوے میں آجاتا ہے۔ اور اس کے اکسانے پر ہیر کا بیاہ سیدے سے رچا دیتا ہے۔ کیدو آخر تک اس کے ذہن و دماغ پر حاوی رہتا ہے۔ جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود اس کی شخصیت کمزور ہے۔

سیدا کھیڑا : سیدے کھیڑے کا کردار افسوس ناک حد تک قابل رحم ہے۔ یہ بڈھا کھوسٹ ایک سادا لوح دیہاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ احمق نہ ہوتا تو جوانی ہی میں اس کا بیاہ ہو گیا ہوتا۔ وہ بڑا

خوش تھا کہ ہیر جیسی خوبصورت دُلہن اُسے مل گئی ہے۔ لیکن یہ خوشی گریز پا ثابت ہوئی۔ شبِ زفاف کو ہیر نے اس کی خوب کندی کی اور پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اس کے بعد بیچارے سیدے کو ہیر کے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے باوجود اسے اس بات پر فخر تھا کہ ہیر اس کی بیوی ہے۔ جب ہیر نے ظاہر کیا کہ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے اور سیدا رانجھے کو علاج کے لئے بلانے باغ میں گیا تو رانجھے نے اسے پکڑ کر دہ مارا اور وہ پھینیاں دیں کہ سیدے کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ وارث شاہ نے سیدے کو عمداً سیدھا سادہ اور کمزور دکھایا ہے کہ اس کے بغیر ان کے قصے کے داخلی تقاضے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

ان کرداروں کے علاوہ ملکی، اچو، عیالی، مٹھی نائن، قاضی، ملّا، راہیل کے ذیلی کردار ہیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ ملکی ایک سخت گیر ماں ہے۔ مٹھی نائن ہیر کی ہمراز ہے اور ہیر اور رانجھے کی ملاقاتیں چوری چھپے اپنے گھر کراتی ہے۔ وہ عشق و محبت کے راز بھی کھول کر بیان کرتی ہے۔ یہ سب کردار دیس پنجاب کی بھومی کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور دیہات کی زندگی سے لئے گئے ہیں۔ ان کے مثیل آج بھی اپنی اپنی حسرتوں، ارمانوں، مایوسیوں، خوشیوں، تمناؤں، نفرتوں اور محبتوں کے ساتھ دیہات میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں +

لے زمین، جنم بھومی، کی بھومی اسی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

زبان و بیان[1]

وارث شاہ پہلے عظیم شاعر ہیں جن کے کلام میں پنجابی زبان اپنی پوری تابناکی، وسعت، لچک اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ وارث شاہ کے پاس الفاظ وتراکیب کا ایک لازوال ذخیرہ ہے۔ جس میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، بھاشا کے الفاظ موجود ہیں لیکن اس بے ساختگی کے ساتھ استعمال میں آئے ہیں کہ غریب اور نامانوس معلوم نہیں ہوتے اور پنجابی کی اصل لطافت اور شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ ہیر وارث شاہ کے مطالعے سے پنجابی زبان کے تموّل کے ساتھ اس کی قدامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پنجابی دُنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ بعض لوگ پنجابی زبان وادب کا آغاز عبدی کی نظم اور جعفر زٹلی کے خرافات سے کرتے ہیں۔ دوسرے بابا فرید کے چند جملوں میں، گورو نانک کے ملفوظات میں اس کی ابتدا کا کھوج لگاتے ہیں۔ اس ضمن میں پنجاب کے فارسی گو شاعر مسعود سعد سلمان کے گمشدہ دیوان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے لیکن بات اتنی سادہ و سہل نہیں ہے۔ پنجابی کو شمال مغربی پراکرت پیشاچی یا اپ بھرنش کا روپ قرار دینے سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ موضوع ایک مستقل تالیف کا متقاضی ہے۔ یہاں ہم مختصراً پنجابی کی قدامت کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

---

[1] آریائی زبانیں از سدھیشور ورما۔

پنجاب کی سرزمین میں آریائی قبائل ۱۵۰۰ ق م اور ۲۰۰۰ ق م کی درمیانی صدیوں میں وارد ہونا شروع ہوئے۔ آریا اُجڈ اور وحشی تھے جو گھوڑے پالتے تھے۔ اور اپنے دیوتاؤں اِندر، اگنی، وایو وغیرہ کی ستائش میں منتر پڑھتے تھے۔ ان کی بولی جسے بعد میں ویدک کہا گیا، سنسکرت کی ابتدائی صورت تھی اور مجوسیوں کی اَوِستا کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ آریاؤں کے ورود کے وقت پنجاب اور سندھ میں دراوڑی تمدن کی نشوونما پر کم از کم ایک ہزار برس گذر چکے تھے۔ موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے تمدن اور سُمیریا کے تمدن میں معاصرت کے علاوہ حد درجہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ ابھی تک آثارِ قدیمہ کے علماء یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ قدامت کی رُو سے ان دونوں میں کس تمدن کو اوّلیت دی جائے۔ موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے کھنڈروں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دراوڑ بڑے سلیقے اور اہتمام سے منصوبہ بندی کر کے اپنے مکان تعمیر کرتے تھے۔ شہروں کے گلی کوچے کشادہ رکھتے تھے۔ نہانے کے تالاب بناتے تھے۔ پانی کے نکاس کے لئے زمین دوز نالیاں نکالتے تھے۔ اور غلّے کے ذخیرے کیلئے گودام تعمیر کرتے تھے۔ وہ کھیتی باڑی کے ماہر تھے۔ باربرداری کے لئے چھکڑوں میں بیل جوتتے تھے۔ دودھ اور مکھن کے لئے بھینسیں پالتے تھے۔ برتن بنانے، زیور گھڑنے اور کپڑا بننے کے فن جانتے تھے۔ ان کے مذہب میں سانپ کی پوجا اور درختوں کی پوجا شامل تھی۔ وہ ایک ناچنے والے دیوتا اور کالی دیوی کی پرستش کرتے تھے۔ بعض مجسموں سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ یوگیوں کی طرح سمادھی میں بھی بیٹھتے تھے۔ لی بان کے خیال میں پنجاب اور سندھ کے یہ قدیم باشندے تورانی الاصل تھے۔ اور ان کی بولی تورانی بولیوں کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ بہرحال دراوڑوں نے قلعہ بند ہو کر آریاؤں کا مقابلہ کیا لیکن ہر کہیں شکست کھائی۔ آریاؤں نے نہایت سفاکی سے ان کا قتلِ عام کیا، اور ان کے شہروں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیا۔ بقیۃ السیف کچھ جنوبی ہند کی طرف بھاگ گئے اور جو پنجاب میں رہے انھیں غلام (شُودر) بنا لیا گیا۔ فاتحین نے جہاں دراوڑوں سے فصلیں اُگانے، برتن اور زیور بنانے کے ہنر سیکھے وہاں قدرتاً ان کے مذہب اور زبان سے بھی متاثر ہوئے۔ یاد رہے کہ موہن جو دڑو اور ہڑپہ میں مادری نظام معاشرہ قائم تھا یعنی عورت معاشرہ

کا محور سمجھی جاتی تھی اور بچے اسی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اس کے برعکس آریائی قبائل کا عائلی نظام پدری اصول پر مبنی تھا۔ یعنی مرد ہر لحاظ سے عورت پر فائق تھا اور عورت کے ساتھ اپنی اولاد پر بھی پوری طرح متصرف تھا۔ آریاؤں نے دوسرے فاتحین کی طرح ہزاروں دراوڑی عورتیں گھروں میں ڈال لیں۔ جس سے اُن کے مذہب، اخلاق، معاشرے اور زبان پر گہرے اثرات ثبت ہوئے۔ جدید تحقیق کی رُو سے شِودیوتا، اس کی زوجہ کالی دیوی جیسے دُرگا، بھواتی، اُما بھی کہا جاتا ہے۔ اور کرشن (لغوی معنیٰ "کالا") دراوڑی مذہب سے آریائی مذہب میں داخل ہوئے۔ یوگا، ویدانت اور بھگتی کا ماخذ بھی دراوڑی مذہب ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک ادب و شعر کا تعلق ہے عورت کے مرد سے اظہارِ عشق کی روایت بھی دراوڑوں کے مادری نظام معاشرہ سے لی گئی تھی۔ اس ادبی روایت نے ہندوؤں کی شاعری کو روح کی گہرائیوں تک متاثر کیا۔ بنگالی اور ہندی کی عاشقانہ شاعری سے لے کر بھگت شعرا، کے عارفانہ کلام تک ہر کہیں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سورداس، چنڈی داس، میراں، گوونداس اس روایت کے مشہور ترجمان سمجھے جا سکتے ہیں۔ پنجاب کے لوک گیتوں، خاص طور سے ماہیے کے بولوں میں آج تک یہ روایت زندہ ہے۔ ان بولوں میں عورت اپنے ماہی یا ڈھول کو مخاطب کر کے اپنے جذبۂ محبت کا بے ساختہ اظہار کرتی ہے۔ ہیر وارث شاہ کے بارہ ماسے میں ہیر، اور خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں سسّی اپنے دردِ فراق کا اظہار دل دوز پیرائے میں کرتی ہیں۔

آریا فاتحین نے اپنے آپ کو سانولے رنگ کے دیسیوں سے ممتاز رکھنے کے لئے ذات پات کی تمیز قائم کی۔ ذات کے لئے وہ ورن کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جس کا معنیٰ ہے "رنگ" پہلے پہل رنگ کی بنا پر ہی آریائی معاشرے میں طبقاتی تفریق پیدا ہوئی۔ جسے بعد میں برہمنوں نے اپنا تفوق جتانے کے لئے ایک مستقل ادارہ بنا دیا۔ یہاں اس امر کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا ضروری ہے کہ وادیٔ گنگ و جمن کی طرف اقدام کرنے سے پہلے آریا صدیوں تک پنجاب میں مقیم رہے۔ اسی دیس میں انھوں نے راجدھانیاں قائم کیں۔ ویدک بولی کو سنسکرت کے قالب میں ڈھالا،

رگ وید کو مرتب کیا، اور مفتوحین کے نظم مملکت کا طریقہ اپنایا۔ متمدن دراوڑوں کی زبان نو وارد آریاؤں کی بولی سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اس لئے ویدک بولی کا اس سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ ریس ڈیوڈز جو پالی اور سنسکرت کی عالمہ ہیں اور جنھیں بدھ مت پر سند مانا جاتا ہے لکھتی ہیں:[1]

آریائی زبان کی طویل تاریخ کے دوران میں دراوڑی بولیاں بولی جاتی تھیں اور ہم اس خیال کے اظہار کی جرأت کرتے ہیں کہ شمال میں یہ بولیاں اس رقبے سے زیادہ وسیع حدود اور زمانے سے زیادہ مدت تک بولی گئیں جو عام طور پر فرض کی جاتی ہے۔ ویدی بولی نیز باعتبار لب ولہجہ اور باعتبار لغت دراوڑی اثر کی بہت کچھ شرمندہ احسان ہے۔ آریائی بولیوں اور تمام علمی زبانوں میں پالی، سنسکرت اور پراکرت میں اول سے آخر تک دراوڑی اثر کی اس سے کچھ کم آمیزش نہیں ہے جتنی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں بحیثیت حسب و نسب اور قرابت قریبی غیر آریائی عنصر کی آمیزش ہے۔"

ویدک بولی کو سنسکرت زبان بننے تک کم و بیش پانچ سو برس کا عرصہ لگا اور یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے کہ اس کے دوران میں وہ دراوڑی زبان سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ بدھ مت کی ترویج کے ساتھ برہمنوں کی مذہبی اور لسانی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا۔ بدھ اور اس کے بھکشو پالی زبان میں وعظ کہتے تھے اور اسی میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ پالی[2] کو شمالی ہند میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ریس ڈیوڈز کہتی ہیں کہ "پالی کی کتب شریعت کا مقام تصنیف شمالی ہند ہے نہ کہ سیلون" پالی اور دوسری پراکرتیں سنسکرت کی پیداوار نہیں جیسا کہ ہندوؤں کا ادعا ہے بلکہ یہ وہ دیسی اور مقامی بولیاں تھیں جو آریاؤں کی آمد سے صدیوں پہلے پنجاب اور سندھ میں بولی جاتی تھیں اور جن کے سیکڑوں الفاظ سنسکرت میں بھی نفوذ کر گئے تھے۔ نو وارد آریا کھیتی باڑی، سفال سازی، زرگری

---

[1] Budhist India

[2] پالی اور پنجابی میں کئی الفاظ مشترک ہیں۔ مثلاً دُدھ (دودھ) دی (بھی) اگے (آگے) چم (چمڑا) ڈِٹھا (دیکھا) سنگ (سینگ) وغیرہ

معماری، نجاری وغیرہ فنون سے ناواقف تھے۔ اس لئے بامرِ مجبوری اُنھوں نے ان پیشوں سے متعلق دراوڑی زبان کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کئے۔ میکس مولر اور مونیئر ولیمز نے ان الفاظ کے اصل ماخذ سے صرفِ نظر کرا نھیں سنسکرت ہی کے الفاظ تسلیم کرلیا۔ اور دوسری بولیوں میں ان کے دخل و تصرف پر بحثیں کرنے لگے۔ قبطی، سمیری، بابلی، فنیقی جیسی قدیم زبانیں ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے دسیوں الفاظ دنیا بھر کی زبانوں میں آج تک مروج ہیں۔ بعینہٖ مرورِ زمانہ سے دراوڑی یا پنجابی اور سندھی زبانوں کے الفاظ سنسکرت میں بھی بار پا گئے۔ بعد میں برہمنوں کے ادعا کے مطابق سنسکرت کو ہندوستان کی قدیم ترین زبان تسلیم کرلیا گیا اور پالی اور پراکرتیں جو قدیم دراوڑوں کی بولیوں سے یادگار تھیں اور سنسکرت سے کہیں زیادہ قدیم تھیں سنسکرت کی "بگڑی ہوئی صورتیں" بن کر رہ گئیں۔ ہندو جنھیں تاریخ نویسی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ تفاخرِ بے جا کے سبب آریاؤں کو دنیا کی قدیم ترین نسل مانتے ہیں اور سنسکرت کو دنیا کی قدیم ترین زبان منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بعض مستشرقین بھی بر خود غلط برہمنوں کے جھانسے میں آ گئے اور سنسکرت پر دراوڑی زبان کے اثرات کی تحقیق کرنے کے بجائے پالی اور دوسری پراکرتوں کو سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی فروع سمجھنے لگے۔ رہس ڈیوڈز نے اس غلط فہمی کا پوری طرح ازالہ کردیا ہے۔ تاہم ماقبل آریائی زبانوں کے خلاف آج بھی پرانا تعصب باقی و برقرار ہے اور اسی کے تحت پنجابی اور سندھی جیسی قدیم زبانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آریا حملہ آوروں نے مفتوحین کو غلام بنالیا اور انھیں اپنی دیو بانی سیکھنے یا بولنے کی سخت ممانعت کردی۔ اس لئے زیریں طبقے کے لوگ بدستور ملکی بولیاں بولتے رہے۔ شمالی ہند میں وہ جو بولی بولتے تھے اسے پنجابی زبان کی قدیم صورت سمجھا جا سکتا ہے۔ پنجابی آریاؤں کے ورود سے لے کر آج تک کسی نہ کسی صورت میں پانچ دریاؤں کے دیس کی زبان رہی ہے۔ یہی زبان مسلمان فاتحین کے ساتھ ہجرت کرکے دلی پہنچی وہاں سے تغلقوں اور خلجیوں کے ساتھ دکن گئی۔ جہاں اسے دکنی کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس کی صفائی کر کے اسے اردو

کے نام سے پکارا گیا۔ شوکت سبزواری صاحب نے اُردو اور پراکرتوں کے چند الفاظ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ الفاظ درج ذیل ہیں۔

اُردو	پراکرت	اُردو	پراکرت
دودھ	دُدّھ	پُوچھ	پچھّ
پُوت	پُتّ	سات	سَتّ
اُونچا	اُچّ	بھُوک	بھُکّھ
میٹھا	مِٹھّا		

شوکت سبزواری[1] صاحب نے جن الفاظ کو پراکرت کے الفاظ کہا ہے وہ صریحاً پنجابی کے الفاظ ہیں۔ شوکت سبزواری صاحب فرماتے ہیں کہ دکنی کے یہ اجنبی الفاظ ٹکسال باہر قرار دیئے گئے۔ دِسنا (نظر آنا) سٹنا (ڈالنا) کاڈنا (نکالنا) لڑنا (کاٹنا) لوڑنا (طلب کرنا) نسنا (بھاگنا)۔ یہ تمام مصادر پنجابی کے ہیں انھیں دکنی قرار دینا صحیح نہیں۔ جس زبان کو دکنی کا نام دیا جاتا ہے اس کا کینڈا صاف پنجابی کا ہے۔ اور وہ اصلاً پنجابی ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس طرح پنجابی کو لاہوری، سرائیکی، ملتانی، لہندا، پوٹھوہاری، ہندکو، ڈوگر، ماجھی وغیرہ کے نام دے کر انھیں علیحدہ زبانوں کا درجہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے اسی طرح پنجابی کی ایک فرع کا نام دکنی رکھ کر اسے مستقل زبان تسلیم کر لیا گیا ہے حالانکہ اس کے صرف کا ڈول پنجابی کا ہے۔ اسماء صفات پنجابی کے ہیں یہ بات قدرے تفصیل طلب ہے۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ عربی، فارسی اور تُرکی کا قدیم بولیوں کے ساتھ اختلاط محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے اور آل غزنہ کے پنجاب پر حملوں کے وقت عمل میں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان پہلوی اور مقامی بولیوں کا یہ اختلاط پانچویں صدی قبل از مسیح سے شروع ہو چکا تھا جب ہخامنشی خاندان کے ایرانی بادشاہوں نے پنجاب، کشمیر، بلوچستان اور سندھ کے کچھ

---

[1] اردو زبان کا ارتقاء

علاقوں کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ جب خشایارشیا ہخامنشی نے یونان پر چڑھائی کی تو اس کی فوج میں پنجابیوں اور سندھیوں کے دستے بھی موجود تھے۔ سکندر کے حملے تک کم و بیش دو سو برس ایران کا یہ تسلط قائم رہا۔ اس عرصے کے دوران میں سیکڑوں ایرانی خاندان کشمیر اور پنجاب میں آ کر آباد ہوئے۔ آج بھی پنجاب اور آزاد کشمیر کے دیہات میں ارجاسپ، لہراسپ فرامرز، خداداد، مہرداد، نوزداد، گوہرداد وغیرہ خالصتاً ایرانی نام رکھے جاتے ہیں۔ پنجاب کا مشہور شاہی قبیلہ گکھڑ اپنے آپ کو کیانی بتاتا ہے۔ غوریوں اور غزنویوں کے ساتھ پنجاب میں مسلمانوں کا ورود ہوا۔ مسلمان حملہ آوروں نے اپنی ابتدائی بستیاں پنجاب اور سندھ ہی میں قائم کی تھیں۔ غزنویوں نے کم و بیش ایک سو ستر برس پنجاب پر حکومت کی اور یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں اور پنجابی ہندوؤں کا میل جول شروع ہوا۔ پنجابی میں ترکی اور فارسی کے الفاظ کا شمول ہو گیا اور ایک نئی زبان کی داغ بیل ڈالی گئی۔ یہ نئی زبان ظاہراً پنجابی کی وہ صورت تھی جس میں فارسی کے اسماء صفات شامل ہو گئے۔ جب قطب الدین ایبک نے دِلّی کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا تو اس کے لشکر کے ہزاروں پنجابی سپاہی اور کارندے دِلّی کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ غزنوی سلاطین پنجاب کے شجاع اور حوصلہ مند جوانوں کو بڑے شوق سے اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ محمود غزنوی نے ہندو پنجابیوں کا ایک مستقل لشکر مرتب کیا تھا جو زابلستان میں قیام پذیر ہوا۔ جب پنجاب کے ہندو جاٹ، گوجر اور راجپوت مسلمان ہو گئے تو مسلم فاتحین کے لشکروں میں جوق در جوق بھرتی ہوئے اور ہندوستان کی تسخیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ غیاث الدین تغلق نے پنجاب سے دِلّی کا رُخ کیا تو اس کے لشکر میں ہزاروں پنجابی جوان تھے۔ اسی طرح سیّد خضر خاں جسے امیر تیمور نے پنجاب کی صوبہ داری عطا کی تھی پنجابی تھا۔ جب اس نے دِلّی پر چڑھائی کی تو اس کی فوج میں ساٹھ ہزار پنجابی سپاہی تھے۔ لودھی پٹھانوں کا خاندان بھی ملتان میں آباد تھا۔ بہلول لودھی نے دِلّی پر یلغار کی تو اس کا لشکر پنجابیوں ہی پر مشتمل تھا۔ محمد تغلق نے دِلّی کو چھوڑ کر دولت آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو پنجابی سپاہیوں کا لشکر اس

کی قیادت میں تھا۔ اس طرح لاکھوں پنجابی دلّی اور دکن پہنچے اور وہیں بود و باش اختیار کی۔ ان کی زبان پنجابی تھی جس میں حسب ضرورت عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ شامل کر لئے گئے تھے۔ جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں پنجابی کو لاہوری یا ملتانی کہا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے پنجاب کے مغربی حصے کی زبان کا نام لہندا رکھا اور اسے علیحدہ زبان سمجھا لیکن پنجابی اور لہندا ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ پنجابی پانچ دریاؤں کے دیس کی زبان ہے۔ پنجاب کے مختلف حصّوں کی بولیوں میں لب و لہجہ کے اختلاف سے اس زبان کی وحدت مجروح نہیں ہوتی۔ جس طرح آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ، اضلاع متحدہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کی زبان کو لب و لہجہ کے اختلاف کے باوصف انگریزی ہی کہا جاتا ہے۔ بہر حال دکن میں پنجابی لشکریوں کے ساتھ جو زبان پہنچی اسے دکنی کہا جانے لگا۔ یہ زبان اصل پنجابی سے قدرے مختلف صورت اختیار کر گئی تھی لیکن اس کا ڈول پنجابی ہی کا تھا۔ بہمنی خاندان دکن میں دو سو برس تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بادشاہوں میں محمد قلی قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ شاعر تھے۔ ان کی زبان پنجابی کی وہی صورت ہے جسے غلطی سے دکنی کا نام دیا گیا۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہم چند مثالیں دیں گے۔

مُلّا نصرتی دکن کا مشہور شاعر تھا جس نے اپنی مثنوی "گلشنِ عشق"[1] میں منوہر اور مدمالتی کی داستانِ محبت نظم کی ہے۔ یہ مثنوی ولی سے کم و بیش ساٹھ برس پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں پنجابی زبان کا ذخیرہ ملاحظہ ہو :

اُتاول (بے قراری) اجو۔ اجے (ابھی تک) انپڑنا (اپڑنا۔ پہنچنا) انت (انتہا) اُتاولا (بے قرار۔ جلد باز) بست (چیز بست) بھار (بوجھ) بھجن (بھجن۔ ٹوٹنا) بھوئیں (زمین۔ اراضی) پاڑنا (پھاڑنا) تواٹی (بربادی) جداں (جب سے) ڈونگا (گہرا) سٹیا (ڈال دیا) سرس (بہتر۔ برتر) سُنک (خشکی) سنگ (ہمراہ) سیوا (خدمت) گالنا (پگھلانا) گشتی (آوارہ عورت)

---

[1] مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق۔

لاب (لابھ. فائدہ) ڈسنا (ڈسنا) نال (ساتھ) تجھایا (غور سے دیکھا) نوا (نواں. نیا) نیڑے (نزدیک) ناٹھنا (نٹھنا. بھاگنا) ہور (اور)

مثنوی "من لگن" قاضی محمود بحری نے لکھی تھی اس میں پنجابی کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:[1]

دھسنا (سمانا) دیوا (چراغ) کوڑ (ناقص. جھوٹ) بوتا (اونٹ کا بچہ) مول (اصل) اُچا (بلند) اگھے (آگے) ماس (گوشت) کرڑا (سخت. کڑا) آکھے (کہے) ناڑا (ازاربند) بانھہ (بازو) تونبڑا (خشک کدو) چوکھنڈ (چار دیواری) چغتہ (چغتائی. مغل) دوس (قصور. الزام) سانگ (برچھی) سجن (دوست) سرس (زیادہ. بڑھ کر) گھیو (گھی) نیڑے (نزدیک)

"پھول بن کی" مثنوی ابن نشاطی کی تالیف ہے. اس میں بھی پنجابی کے الفاظ کی کثرت ہے.

نِت (ہمیشہ) دیتا (دیا) کیتا (کیا) سٹیا (ڈالا) آپی (آپ ہی) جیوں (جس طرح) نئیں (نہیں) مُوں (چہرہ) ویکھن کوں (دیکھنے کو) دسیا (نظر آیا) کدھیں (کبھی) سٹ کر (چھوڑ کر. پھینک کر) انجھواں (ہنجھوں. آنسو) اولائی (اوبیل. جوش) اوچا (اونچا) تجھ باج (بالجھ. تیرے بغیر) کاند (دیوار) اولنگنا (پھلانگنا) ماندا (بیمار. خستہ) نوے (نئے) چکڑ (کیچڑ) جناور (جانور. پرندہ) ترت (فوراً) اُتم (عمدہ ترین)

"سب رس" وجہی میں بھی پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں. مثلاً لوڑیا (تلاش کیا) اُساس (آہ) چٹ (لالچ) دڑی مارنا (چپ کر جانا) ریجھ (شوق. ولولہ) سواں (قسمیں) کاند (دیوار) کنے (پاس) کدھاں (کب) لوڑنا (تلاش کرنا) لیایا (لے آیا) ناہوسی (نہ ہوگا) مشابہی (مماثلت) وغیرہ۔

دلی اور لکھنؤ میں صفائی زبان کے نام پر پنجابی کے الفاظ اور روزمرہ یکسر خارج کر دیئے گئے. پنجابی روزمرہ اور محاورہ کے بجائے سیکڑوں فارسی محاورے حرف بہ حرف ترجمہ کر کے اخذ کئے گئے. پنجابی کے اسماء و افعال کے اخراج کے ساتھ ملکی تلمیحات سے بھی قطع نظر کر لی گئی. اس

---

[1] مرتبہ محمد سخاوت مرزا.

"صفائی" کے بعد جو زبان صورت پذیر ہوئی اس پر فارسی کی تشبیہات، تلمیحات اور اسالیب کا پیوند لگایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس غیر فطری عمل سے اردو سے ملکی بو باس اور مٹھاس غائب ہو گئی۔

حافظ محمود شیرانی بجا فرماتے ہیں :

"اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر طیار ہوا۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع افعال کی تعریف کا اتحاد اس ہی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ کا ایک مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے ان زبانوں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے۔ وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعرا اور تعلیم یافتہ طبقے نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انھوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی ہے مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیم اصول، جن پر زبانوں کی تعمیر ہوئی تھی، جامع، مفید اور کار آمد تھے۔ پرانی جمع کے قاعدے کو انھوں نے بالکل بے کار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حرفِ علت اور نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن افعال و اسماء سے جمع مونث کو ترک کر دینے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔" (پنجاب میں اردو)

ہم حافظ شیرانی مرحوم سے اس بات میں اختلاف کرنے کی جسارت کریں گے کہ نونِ غنہ کے اخراج نے بھی اردو زبان کی موسیقیت کو مجروح کیا ہے جس طرح آجکل مغربی پنجاب میں نونِ غنہ اور "ڑاں" کے اخراج سے پنجابی کے صوت و آہنگ کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ بہر حال جیسا کہ شیرانی مرحوم نے فرمایا ہے اس نام نہاد اصلاح اور صفائی کے باوجود اردو اور پنجابی میں ساٹھ فیصد الفاظ مشترک ہیں۔ یاد رہے کہ "صفائی" اور "اصلاح" کا یہ عمل ناسخ پر ختم ہوا تھا جب

اس نے سیکڑوں پنجابی کے اسماء و افعال کو ٹکسال باہر کیا. لیکن درمیانی دور کے اُردو شاعروں خاص طور سے سودا، میر تقی میر، انشا، اور نظیر اکبرآبادی کے کلام میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں. ان شعراء نے پنجابی روزمرّے اور محاورے کو بھی آزادی سے برتا ہے. یہاں ہم میر تقی میر کے کلام سے مثالیں دیں گے .

منظور ہو نہ پاس ہمارا تو حیف ہے
آئے ہیں آج دُور سے ہم تجھ کو تاڑ کر[1]

کس کس کو میرؔاں نے کہہ کر دیا ہے بوسہ
وہ ایک ہی معتق یوں ہی پُچّا رہے

دل لے کے لونڈے دلّی کے کب کا پچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

فرہاد و قیس ساتھ کے سب کب کے چل بسے
دیکھیں نباہ کیونکہ ہو اب ہم چھڑے رہے

سنگِ بالیں میرؔ کا جو باٹ کا روڑا ہوا
سخت کر جی کو گیا اس جا سے وہ رنجور کیا

جب سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میرؔ مُنڈکری سی مار سو رہا

باقی نہیں رہا کچھ گھٹتے ہی گھٹتے ہم میں
بیماریٔ دلی نے چنگا بہت بنایا

وہ تو ہی ہے کہ مرتے ہیں سب تیرے طور پر
جز دوری کو جان کے کب ہیں دوال ہم

تیرِ ستم کا تیری ہدف کب تلک رہوں
آخر جگر ہے لوہے کا کوئی توا نہیں

ڈھایا جنوں نے اس کو ان پر خرابی آئی
جانا گیا اسی سے دل بھی کسو کا گھر ہے

اے غیر میرؔ تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سیّد نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

نکہتِ خوش اسکے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے
اس سبب گُل کو چمن کے دیر میں نے بُو کیا

تازہ جھمک تھی شب کو تاروں میں آسماں کے
اس آسیا کو شاید پھر کر کسو نے راہا

کیا تم کو پیار سے وہ اے میرؔ منہ لگاوے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اُس کا

مت ان نمازیوں کو خانہ سازِ دین جانو
کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

---

[1] اقبالؔ کا ایک مصرع ہے ع بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا. اس پر اہلِ زبان نے تعریض کی تھی کہ تاڑا پنجابی کا لفظ ہے اس لئے غیر فصیح ہے. خدا معلوم وہ میر تقی میرؔ کے 'تاڑ کر' کو کیا کہیں گے.

رہ گئے منہ تنوں سے نوچ کے ہم
گر ہوس ہے اسی قدر ہے بس

کیا چھپنے کا فائدہ جو شیب میں چھپا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

جوں دود عمر گذری سب پیچ و تاب ہی میں
اتنا ستا نہ ظالم ہم بھی جلے بلے ہیں

ہر چند جائیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے
تم کو ہمارے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ

چھپ ملک کے بام و در سے گلی کوچے میں میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

بھر دی تھی چشم یار میں یارب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے چھک گئیں

تنگ پوشی تنگ درزی اس کی جی میں کھب گئی
کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا

اڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے
مبادا مجھ کو بھی گڈا بنا دے

بیکسانِ عشق تھے ہم غم میں کھپ سارے گئے
بازخواہِ خوں نہ تھا مارے گئے مٹے گئے

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر
اپنی ٹکّی لگائے جاتا ہے

کوئی عمامہ لے بھاگا کنھوں نے پیرہن پھاڑا
بہت گستاخیاں یاروں نے کیں واعظ کی خدمت میں

برسوں میں کبھو ایدھر تم ناز سے آتے ہو
پھر برسوں تئیں پیارے جی سے نہیں جاتے ہو

ہیں جزو خاک ہم تو غبارِ ضعیف سے
سر کھینچنے کا ہم کنے سامان ہی نہیں

ایک رباعی: کیسو یہ کہ عیش و کامرانی کریے
یا خوب طرح سے زندگانی کریے

سگ کا، نہ ہوا ہمیں تو رتبہ حاصل
تا کوچے کی اس کے پاسبانی کریے

انشاء اللہ خاں انشاء کے ہاں بھی پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں ؎

ہے بندھا مینھ کے تار کا جھولا
کیوں نہ لے جھونٹے یار کا جھولا

اب کسی موذی کو جڑتا ہوں پھر اک تنگ گھونٹا
ہو مدد حق ہو مدد ہو ہو مدد ہا مدد

جس سے کہ چکلے چکلے لاگیں لگایاں ہوں
لازم ہے یہ کہ منہ پہ اس کی رکھائیاں ہوں

لیس لی جھپتی سوا اللہ کا
پرتوا ان میں جد نہ تد دیکھیو

ہزار طرح کی فکریں خراب کرتی ہیں
غرض نہ پوچھو کہ انسان کس تآزمو رہے

رہا ہے ہوش کچھ باقی اسے بھی اب نبیڑے جا　　یہی آہنگ اے مطرب لیے ٹک اور چھیڑے جا

کیا بھلا شیخ جی تھے دیر میں تھوڑے پتھر　　کر چلے کعبہ کو تم دیکھنے دوڑے پتھر

باجی کی باس میں جو رچی اک چنبے کی باس　　تو ٹھیک ٹھیک ہوگئی دلہن بنے کی باس

میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' سے بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

مرد کی ذات بے وفا ہیگی　　ان کے ملنے میں سب دغا ہیگی

وہ ترا واشگاف ہو جانا　　پھر وہ لڑ بھڑ کے صاف ہو جانا

ہنستا پائی سے ہانپتے جانا　　کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا　　وہ ترا جیبھ کا لڑا دینا

پنجابی کا نفوذ دکن تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ راجستھان میں بھی اس کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ میراں کے بھجنوں میں کثرت سے پنجابی کے الفاظ پائے جاتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

—— سرت کی کھیتی کا چھوں گی

—— ایسی ہے کوئی پریم سنیہی ترت سنیہا لاوے

—— تم بلیاں بن پران دھرت نہیں دھیر

—— چانچ کٹاؤں پپیہا رے اوپر کالو رے لون

—— اب چھوڑت نہیں ہے پربھو جی

—— ہنس کر ترت بلاؤ

—— پیو پیو میں رٹوں رات دن دوجی سدھ بدھ بھاگی

—— دھرتی روپ نوا نوا دھریا اندر ملن کے کاج

—— اودھی بدیسی اجوں نہ آئے

ناسخ اور اس کے متبعین نے اردو شاعری سے پنجابی کے اسماء، افعال اور روزمرہ کو خارج کر دیا لیکن نثر سے ان کو خارج کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ اردو کے صاحب

طرز انشا پردازوں اور قصہ نویسوں کے یہاں کثرت سے پنجابی کے الفاظ ملتے ہیں رتن ناتھ سرشار لکھنؤ کے مشہور قصہ نویس تھے۔ ان کی کتابوں سے ہم پنجابی کے الفاظ پیش کرتے ہیں :

خدائی فوجدار : پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنا۔ کورے کا کورا رہا۔ میرے پیٹ میں بات پچتی نہیں۔ ہم تمہیں چنگا کر دے گا۔ اُپلے پاتھ رہی تھی۔ ایک گبرو جوان ادھر سے گذرا۔ عقل کے پیچھے سونٹا لے کر دوڑتے ہو۔ گیڑیاں کھیلیں گے۔ زمین پولی رکھی کہ مخالف گر جائے۔ نہ جاتا تو اس دہاڑے کو کاہے کو پہنچتا۔ کھری مزدوری چوکھا کام۔ جلتے بلتے انگاروں میں جھونک دیا۔ عورت اس پر ریجھ گئی۔ اس سودائی سے جان کھپی کرنی پڑی۔ دھوپ میں چونڈا سفید نہیں کیا۔ مکان ڈھے گیا۔ لون لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ پچھے دور یہاں سے۔

فسانۂ آزاد : پیر مرد کھانگتے کھونگتے آن کھڑے ہوئے۔ جھلنگے سے باہر نکلے۔ چونٹے اٹھائی گیرے۔ اس کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ دونوں بہنیں سیانی تھیں۔ روح کی چول چول ہلا ڈالی۔ مجھے الٹا دیا۔ نک چڑھی اس لڑکی کو گانٹھ لے۔ یہ بادل جھڑی کا پیش خیمہ ہے۔ آپ کے گھنے پن سے جلتی ہوں۔ منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ پوتڑوں کے رئیس ہیں۔ تگڑا آدمی ہے۔

جام سرشار : کسی سے پوچھا نہ گچھا۔ پھٹے منہ۔ پھٹے حال۔

محمد حسین آزاد جیسی اردو کس نے لکھی ہوگی۔ ان کی " دربارِ اکبری " سے مثالیں دی جاتی ہیں :

مارے خوشی کے چک پھیریاں لیا کرتا تھا۔ ملا روٹی توڑ شروے چپٹ۔ ہاتھی لانگتے پھلانگتے چلے جاتے۔ بڑا سرتا سیانا تھا۔ ہانڈی میں جو ہوتا ہے وہی ڈوئی میں آتا ہے۔ ایک لپ بھر اشرفیاں دیں۔ دل میں کھوٹ کپٹ کچھ نہیں۔ سونے چاندی کے باسن دیئے۔ میں بے گنے لوگوں کے چیتے دیتا ہوں۔ باتوں سے بھلاوے میں ڈالا۔

برف کے ڈھیمے۔

قصص ہند : ٹکور۔ ٹھنڈے ہوئے۔ کھڑاک۔ پرچتے پرچاتے۔ گھوڑے کی ایل۔ ننگے بچے۔

مولوی نذیر احمد دہلوی روزمرے اور محاورے کے بڑے رسیا تھے۔ ان کے اس شوق کے باعث پنجابی کے الفاظ کثرت سے ان کی کتابوں میں دکھائی دیتے ہیں "المحصنات" سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

چونٹوں لموں کی طرح۔ پھٹنے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتا۔ سختی سے سوم بھلا جو ترت دے جواب۔ بہتے سے اکھڑا ہوا تھا۔ کنتی اس کی للو پتو میں لگی رہتی ہے۔ تم کو اسی کا پھنا پڑا رہتا ہے۔ آدمی آنکھوں پر ٹھیکری دھر لے۔ چاین چپڑ کرنا۔ گھر کی چیز بست دھرے اٹھائے۔ تڑاتڑ آٹھ دس لتیڑے رسید کئے۔ تھوتی (تھتم)۔ گجی مار (گجھی مار)۔ بوہنی کراؤ۔ آلکسی (سستی)۔ ادوان۔ جھلنگا۔ کڑک مرغی۔ کتی دینا۔

پیارے لال آشوب نے "من سکھی سندر سنگھ" کا قصہ ۱۸۶۸ء میں لکھا تھا وہ بھی بے تکلف پنجابی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں :

سائیں کے بھنڈار میں کوئی کمی نہیں۔ تیرے چاچا نے تو کتے کے برابر بھی آدر (تواضع) نہ دیا۔ لڑکی تو کا نرسی ہے۔ اس کی آنکھ میں کھتی ہے۔ کھارا (تیلیوں کا ٹوکرا)۔ لڑکی سندر ہے اور اسی گھر جوگ ہے۔ عورت جاگی اور بہت رولا کیا۔ چھوری ایسی جیسے گنڈے کا ٹکڑا۔ چھوری کا ڈوم چھلا۔

اصلاح اور صفائی کے باوجود پنجابی کے سیکڑوں الفاظ آج بھی اردو میں موجود ہیں۔ اردو والے پنجابی سے ناواقف ہونے کے باعث انھیں پراکرت، دکنی یا بھاشا کے الفاظ سمجھتے رہے ہیں۔ یا من مانے معنی پہناتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں مثنوی من لگن' کے مرتب نے ایک لطیفہ بیان کیا ہے۔ محمود بحری کا شعر ہے ؎

سُل ہے مجھے جو دانت کی اور زلف کی تری   اس سین کو سرن ہے اور اس لام کو سلام

سُلنا پنجابی کا مصدر ہے جس کا معنیٰ ہے سوراخ کرنا۔ ابواللیث صدیقی صاحب پنجابی نہیں جانتے۔ سُل بالفتح کو بالکسر پڑھا اور مزاحاً لکھا کہ کسی عاشق کو سِل کا مرض نہیں دیکھا تھا۔ اردو میں پنجابی کے کئی الفاظ ایسے بھی ہیں جنھیں پنجابی سے ناواقفیت کے باعث تابع مہمل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً جَلا بلا، لڑ بھڑ، جھُپ لُک، چپ چپاتے، دن دہاڑے، ہلنا جلنا، برتن بھانڈا، گورا چٹا، بھلا چنگا، موٹا جھوٹا، سنڈا مسٹنڈا، میں ہر دوسرا لفظ پنجابی کا بامعنی لفظ ہے تابع مہمل نہیں ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ پنجابی زبان کی قدامت، وسعت اور ہمہ گیری کو اجاگر کیا جائے۔ وارث شاہ نے اس قدیم اور متمول زبان میں ہیر رانجھے کا قصہ لکھا۔ اور ٹھیٹ پنجابی کے ایسے سیکڑوں الفاظ، تراکیب، محاورے اور ضرب الامثال ہمارے لئے محفوظ کر لئے جو شاید "ہیر" کے بغیر مٹ مٹا کر رہ جاتے۔ ان محاوروں اور ضرب الامثال میں اظہار و بیان کی شگفتگی، لوک بت کہاؤ کی فطری تازگی اور کسانوں کی دانش و خرد کا لطیف امتزاج ہوا ہے ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

فند لانڑاں (دھوکا کرنا) سُتیاں کلاں جگانڑاں (فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کرنا) تھال وچ پدنڑاں (ناشکری کرنا) دُدھ وچ اَک چونڑاں (رنگ میں بھنگ ڈالنا۔ مرچاں لون دی چاٹ لگانڑاں (نون مرچ لگانا) پیڑ ونڈانڑاں (غم خواری کرنا) مکھ بھوانڑاں (بے رخی کرنا) یار ہنڈانڑاں (دوست کے وصل سے شادکام ہونا) جاوناں چکناں (ذمہ لینا) سیج نتارناں (بات کی تہ تک پہنچنا) شرم دی لوئی مکھ توں لاہنڑاں (بے حیائی کرنا) کھیسہ کھانڑاں (جھک مارنا) جیت بھرمانڑاں (دل موہ لینا) لوریاں لونڑاں (بامراد ہونا) پنڈ چاونڑاں (ذمہ لینا) جھنج وچ چھٹناں (رسوا کرنا) دودھ بھت ہونڑاں (رشتہ خلطی ہونا) دکھ ترٹناں (تکلیف اٹھانا) تل ہیٹھ انگیار رکھناں (دھوکا دے کر مارنا) ہنبھ کرنا (حوصلہ کرنا) ییال کرنا (فکر کرنا۔ جھگڑا کرنا۔ سودا کرناں) مٹوت وچ

مچھیاں پھڑناں (کمینہ پن کا اظہار کرنا) سنڈا چونڑاں (ناممکن کو ممکن کر دکھانا) لیڑے لاہ لینڑاں (لوٹ لینا) لکھاں وچ انگلیاں رکھناں (راز چھپانے کی ناکام کوشش کرنا) گھول گھماونڑاں (قربان ہونا) کھوہ اٹّا گیڑناں (الٹی بات کرنا) مُجھ دے اگے بین وانے بجیاں (سعی رائیگاں کرنا) چن چڑھنا (خوش ہونا) گلّاں اُتے بھنبیریاں اُڈناں (حسن وجمال کا دکھنا) باندر پھلیاں دا راکھا۔ کچریاں دا راکھا گدڑ۔ جواں دا راکھا کھوتا (ایسا محافظ مقرر کرنا جو حفاظت کرنے کے بجائے نقصان پہنچائے) بھاڑا جھاڑناں (ٹھگ لینا) ٹہل ٹکور کرانڑاں (خدمت لینا) جٹ تے بھپّٹ بدھے قابو آوندے تیں دَبھیڈاں وچ اُنھ چھپانڑاں (احمق ہونا) ڈنڈیاں بلکناں (منت کرنا) دل دی گنڈھ کھولناں (کدورت کا باقی نہ رہنا) تھال وچ لُون بھنناں (احمقانہ حرکت کرنا) لوہا تا کے جیبھ نال چٹّناں (عذاب جھیلنا) ڈور بھور ہونڑاں (حواس باختہ ہوناں) اکھیاں وچ چونہدی وٹّناں (آنکھ سے ذومعنی اشارہ کرنا) دل ڈولانڑاں (مائل ہونا) ڈول ڈالناں (ڈیرہ ڈالنا) جوڈے کھرکدیاں رہناں (بیکار بیٹھے رہنا) درلاپ کرناں (فریاد کرنا) کمھ بھوانڑاں (بے اعتنائی کرنا) موہڈیاں اُتوں تُھکاں سُٹنا (جوانی کی بدمستی کرنا) لوک چرانا (سب کو دھوکا دینا) کواردیاں چونڈیاں کھولناں (اِزالۂ بکارت کرنا) رتّے ساہن وانگوں اُڈی مارناں (خرمستی کرنا) رنّاں وَلاونڑاں (عورتوں کو ورغلانا) مُنجیاں ہتھ کرنا (بھاگ کھڑا ہونا) جیبھ ساں تے چڑھانڑاں (زبان درازی کرنا) متّاں پکانڑاں (صلاح مشورہ کرنا) بوہے بوہے پھرناں (آوارہ پھرنا)۔

کھوارڈے کول اگ دیناں (خطرہ مول لینا) اولڑے بول بولنڑاں (الٹی باتیں کرنا) نیہوں لگاونڑاں (پیار کرنا) دل دی گھنڈی لاہناں (غصہ دور کرنا) بُرکیاں گننّاں (خسیس ہونا) چیڑ وجاونڑاں (خوش ہونا) بجا جالناں (عذاب جھیلنا) دِس کھولناں (قہرِ درویش برجانِ درویش) چوبارے چاڑھ کے پوڑھیاں چانڑاں (دھوکا دینا) پیڑھیاں پُنّناں (گالیاں دینا) چور اُچکا چوہدری گنڈی رن پھردان۔ بولیاں مارناں (طعنے دینا) لیک لانڑاں (بدنامی کا باعث ہونا) کھسماں دا سر کھانڑاں (لعنت بھیجنا) پت لاہ لینڑاں (بے عزت کرنا) پوچ بہناں (ہاتھ سے دے بیٹھنا)

پہاڑ تولناں (بہت بڑا جھوٹ بولناں)، جوانیاں مانڑاں (جوانی کے مزے لوٹنا) جھولی اڈناں (خیرات مانگنا) ڈھاک مروڑناں (عورت کا کولھا پکڑ کا کر چلنا) ریجھ لاہنڑاں (شوق پورا کرنا)۔ بھُوہے ہونڑاں (گستاخی کرنا)، کھتے پینڑاں (پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑنا)، متھا ڈاہناں (مقابلہ کرنا) ہمبھ جانڑاں (تھک کر چور ہونا)

ہیر وارث شاہ میں ہزاروں الفاظ ہیں جو خالصتاً پنجابی کے ہیں اور کسی دوسری زبان سے ماخوذ نہیں ہیں۔ یہی بات ہم اُردو یا ہندی سے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ بدقسمتی سے ابھی تک دراوڑی تحریریں پڑھی نہیں جا سکیں۔ اس لئے ہم حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ پنجابی میں فلاں فلاں لفظ دراوڑوں کے عہد سے یادگار ہیں۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مردہ زبانوں کے الفاظ بھی کسی نہ کسی جدید زبان میں پائے جاتے ہیں تو ہم وراثیتاً کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی کے وہ الفاظ جو ترکی فارسی، عربی، سنسکرت، بھاشا کسی زبان میں بھی نہیں ملتے وہ اصلاً ماقبل آریائی دَور سے ہم تک پہنچے ہیں۔ مصر قدیم، سمیریا، بابل، اشور، فنیقیہ وغیرہ قدیم تمدّن فنا کے گھاٹ اتر گئے اور ان کے ساتھ ان کی زبانیں بھی مِٹ گئیں لیکن پنجابی تمدّن کا تسلسل سیاسی انقلابات کے باوجود باقی و برقرار رہا ہے۔ شہروں اور قصبوں میں ان انقلابات کے باعث غیر ملکی تمدنوں اور زبانوں کا یقیناً نفوذ ہوا لیکن پنجاب کے دور افتادہ دیہات کے معاشرے اور زبان تک یہ اثرات کم پہنچے۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے پنجاب اور سندھ میں زرعی معاشرہ قائم تھا جس میں ایسے الفاظ و تراکیب مستعمل تھے جو کھیتی باڑی سے خاص ہوتے ہیں۔ حملہ آوروں میں آریا گڈریے تھے۔ ہُن اور سیتھین صحرائی تھے۔ پٹھان اور مغل کوہستانی تھے اس لئے ان کی آمد اور آبادکاری کے باوجود وہ تراکیب و اصطلاحات جو قدیم زرعی معاشرے میں وضع کی جا چکی تھیں اپنی اصلی صورت میں باقی رہیں۔ مثال کے طور پر وارث شاہ نے جو گھاس کی قسمیں گنائی ہیں ان کے متعلق ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نام وہی ہیں جو زمانہ قدیم میں تھے۔ مثلاً لملی، سرالا، گرہم، سمبھر، وٹل، مُرک، کھبل، دھامن، چوراں، لُونک، سوانک، ڈیلھ، کاہی، اِٹسی

طرح بھینس بھی ما قبل آریائی دور سے پنجاب میں پالی جا رہی ہے۔ پنجاب کے زرعی معاشرے میں اسے جو اہمیت حاصل رہی ہے دنیا کے کسی زرعی معاشرے میں نہیں رہی۔ چنانچہ وارث شاہ نے بھینس کی جو قسمیں گنائی ہیں ان کے نام ہندوستان اور پاکستان کی کسی قدیم و جدید زبان میں نہیں ملیں گے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ دیہاتی بھی کیا جانتے ہوں گے۔ ان ناموں اور قسموں سے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ما قبل آریائی دور سے چلے آ رہے ہیں نام اور قسمیں درج ذیل ہیں:

ڈھیلیاں، موریاں، لوریاں، کیلیاں، کنڈھیاں، منٹیلیاں، لنڈیاں، روڑیاں، کرٹیاں، کھیپلاں، منسیاں، ہرور، ہائیاں، سُون، پھڑاں، کھ، نگواں، ڈوگلاں، بھتیلیاں، ڈھڈلاں، ڈاگاں۔

وارث شاہ کی ہیر میں ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو خالصتاً پنجابی کے ہیں ان میں چند اسمار صفات، افعال، مصادر درج ذیل ہیں:

اسماء وغیرہ: ارلی، سیاڑ، سَیں، جھوٹی (نوخیز بھینس)، کٹی، کٹا (بھینس کے بچے) چاڑے پاڑے (ہل چلاتے وقت جو کھیت میں خلا رہ جاتے ہیں) لدھا، گواہنڈ، بھا، واہ (اختیار) لیڑا، روڑا، پنڈ، ہک، مجھ (بھینس) مجھّ (کمر) حبیجی، تاون، جھلکا، پٹہ، چھوڈا (دنداسہ) وہڑلیبا، چوُل، ڈور، منگو، کھانگڑ، انڑیں، جھوک، شہتہ، ٹنگھ، بیڑے، کِنگ، سترانڑاں، نترانڑاں، پاکھڑی، پلاکڑی، ساکڑی، بھتاڑ، بوبا، دھرکونا، گھواں، سیھتی، تخیٹھ، چوہنڈی بڑھک، چیٹھ، دھسکل، وہڑ، تاترا، ٹیر، اوت گھتوتی، کھنگل، پھوکڑی، سوکڑی، توکڑی، تیلا (ایک کیڑا جو فصل کو نقصان پہنچاتا ہے) لانچونا، روڑی، ڈھنڈ، وچولی، درلاپ، روڑ، آہر، اوا گھت، ادھول، ادکڑ، اناکھڑی، باہولی، بونتر، بھوہا، پڑانڑاں، پلاکی، بھیر، بھنڈ، بھترہ، ٹوہنی، ٹینس، جبّی، جھنڈو، جھورا ٹھ (لڑکا) چو، لوناں (احمق) کولیکھ، مرکھت، نلّی، منکھ، انابری، رنچھ (بُرا آدمی) سیانڑاں، ٹوبح (دبدبہ) ٹونگی، وِیل، ہتھ، ہتھ، ویر، ہوڑ، ہیک، گھو وغیرہ

مصادر: کھدیڑناں، دانگناں، وتجاپناں، ڈسکناں، ٹرکناں، ٹجرکناں، جھرناں، چھوہناں، لیٹرناں، رنہناں، سلاہناں، گھتناں، اچیباں، گھیتاں، جاناں، دسناں، جھونڑاں، چوہکناں،

ڈاہنڑاں، ترٹھنّاں، اڑانڑاں، ہلپانڑاں، گھسکاوڑاں، کڑناں، مُجنّاں، لوڑناں، گھوکانڑاں، اُلنگناں، الکانڑاں، گیڑناں، کھوترناں، رڑکناں، دُوھاناں، اُسارناں، چوہنڈناں، کھیہناں، اُلارناں، چنڈنڑاں، کھونڈناں، بھڑ تھومارناں، اوسیاں پانڑاں، ورکناں، چانڑاں، کلاوناں، ترٹناں، ونگارناں، الگھاڑناں، باہوڑناں، پُوڑناں، بوہکناں وغیرہ۔

مصر، سمیریا، پنجاب اور سندھ میں تاریخِ عالم میں سب سے پہلا مادری نظام معاشرہ قائم ہوا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں اس معاشرے میں عورت کو مرکزی حیثیت دی جاتی تھی۔ پنجابی زبان کے ڈانڈے اسی معاشرے سے جا ملتے ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ صورت شکل، قدو قامت ڈیل ڈول، عادات و خصائل کے لحاظ سے عورت کی جتنی قسمیں پنجابی زبان میں دکھائی دیتی ہیں شاید ہی دنیا کی کسی دوسری زبان میں ملیں۔ عربی زبان میں تلوار اور گھوڑے کے لئے ایک ایک سو الفاظ پائے جاتے ہیں۔ "ہیر" میں عورت کے لئے ایک سو سے زائد الفاظ موجود ہیں۔ ان میں سے چیدہ چیدہ درج ذیل ہیں:

اناکھڑی (کنواری)، اول سَولی (سب کچھ ہڑپ کر جانے والی)، باندر نکّی (بندر کی ناک والی)، اودھل (اغوا ہونے والی)، سودھل (بیاہتا)، بودلی (احمق)، بوسری (موٹی)، باگڑ بلّی (جس کا چہرہ جنگلی بلّی جیسا ہو)، بھیڑ بھتّی (بدکار)، بھیڑ بھتّی (بدشکل)، پٹاکی (شوخ و شنگ)، پدیڑی (زیادہ پادنے والی)، پنڈولّی (سخت بدن والی)، پھینی (چپٹے ناک والی)، تلدے لاہتی (چالاک)، بڑبولی (شیخی خوری)، بانگی (بھینگی)، پھپھے کٹنی (مکار)، تھالب گلّھی (موٹے رخساروں والی)، ٹھکر ٹھلّی (موٹی تازی)، پھنیری (غصیلی)، ٹوہنی (چھیڑ چھاڑ کرنے والی)، ٹھٹھولی (مذاق کرنے والی)، جھوکی (داسیات)، چھتر نکّی (چپٹے ناک والی)، چھری (ٹیڑھے منہ والی)، جلتھی (کاہل)، جوٹھ (بدکار)، چینُکّی (چھوٹی آنکھوں والی)، چھیل چھبیلی (بے شرم)، چوڑ ناسی (گستاخ)، لوٹنے ہاری (بے رحم)، ڈاری (ظالم) بھیڈوکاری (لڑاکا عورت)، کباڑی (ضدی، اجڈ)، چھٹ (ہٹ دھرم)، چبھاڑی (زبان دراز)، دچولی (دلالہ)، ہوچھی (کمینی)، سونہہ کٹنی (بکواس کرنے والی)، گھتولی (گھی کھا کر پلی ہوئی، مجرّب)

لبوچڑی (موٹی) لَسّقی (خوش مزاج) گھوکل کنّی (جان بوجھ کر بات نہ سننے والی) ملیینی (بظاہر مسکین لیکن بہ باطن چالاک) متقیلی (فریفتہ کرنے والی) گھرڑ گھسی (بدکار) نوّتی (احمق) کوکڑی (اجڈ) کھڑ دنبی (فاحشہ) گربھ گھیلی (بڑے پیٹ والی) کھیوی (بدمست) میل منولی (منانے والی) لٹ باؤلی (نخریلی) گل پھٹہری (ابھرے ہوئے رخساروں والی) وٹ مُنھّی (بد مزاج) دھسکل (فربہ) چتر گھسنی (زانیہ) چھینچھر ہاری (شوخ و شنگ) چنچیال (بدکار) ڈھاک مروڑی (کولھا پھڑکا کر چلنے والی) سوئن چڑی (مالدار) کُچّجی (پھوہڑ) کدّو گلھی (موٹے رخساروں والی) چھیر چڈی (بدکار) دھریل (داشتہ. بے نکاحی) کنت بڑولی (جسے شوہر نے چھوڑ دیا ہو)۔ کھیڈ کھنڈوہنی (ہنسی میں ٹرخانے والی) کیری (گربہ چشم) سنس منتی (شوہر کو منانے والی) لوتری (گستاخ) لل ولّی (احمق) موموں ٹھگنی (میٹھی باتوں سے رام کرنے والی) پُھڑنکی (چپٹے ناک والی) گینڑیں (پستہ قد) گُتّی (بے عزت، لڑاکا) پچھ پیری (منحوس) چھجاڑی (زبان دراز) کباڑی (ضدی. احمق) گھوٹنی (چھوٹے قد والی موٹی تازی) انگ جھپیڑی (بدن سکیڑنے والی) چھیڑی (کنجوس) دوکھی (کینہ پرور) ڈھگڑ دھیل (بہت ہی موٹی) سج سجیڑی (بناؤ سنگار کرنے والی) سنجی (سلیقہ شعار) لوہے لاکھی (غصیلی) منڈھر مٹی (بہت چھوٹے قد والی) ہسنی (جو اکثر مسکراتی رہے) کپڑ جھڑی (بے عزت) سنول (صلح کرانے والی) نک ٹھوکی (موٹے ناک والی) مٹھڑی (فریفتہ) چھانگی (جس کے ہاتھوں میں چھ انگلیاں ہوں) اُچاہتی (گستاخ) ہرہاری (ہرجائی) نڈھی (نوخیز) مٹیار (جوان عورت) سوانی (شریف) مان متی (اپنے حسن پر غرور کرنے والی) ٹھگنی (موہ لینے والی) ۱۰۱

لُطفِ بیان : وارث شاہ کا کلام سراپا انتخاب ہے۔ ہیر کو کہیں سے بھی پڑھنا شروع کیجئے اظہار و بیان کی تازگی ایک نظر میں آپ کو مسحور کر لے گی۔ وارث شاہ نے ابتدائے عشق کی وارفتگی، وصال کی شادکامی اور خود سپردگی، دردِ فراق کی سوزناکی، چاہنے والوں کی والہانہ شیفتگی، امید و بیم کی آویزش، شادی بیاہ کی رسوم، عورتوں کی نوک جھونک

دیور بھابیوں کی طنز و تعریض، دیہاتی زندگی کی وصف نگاری، قدرتی مناظر کی تصویر کشی، دیہاتیوں کے اوہام، معاشرے کے مختلف طبقوں کے افراد کا طرزِ گفتگو جیسے متنوع مضامین پر استادانہ چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ یہ خلوص جذبہ کا کرشمہ ہے اور دقتِ مشاہدہ کا کمال ہے کہ ہیر کو پڑھنے والا بے اختیار اپنے آپ کو اس سحرِ حلال کے سپرد کر دیتا ہے ہم نے گذشتہ اوراق میں جو اشعار نقل کئے ہیں ان سے وارث شاہ کی قادر الکلامی کا روشن ثبوت ملتا ہے تاہم قارئین کی ضیافت طبع اور خود اپنی حظ اندوزی کے لئے ہم چیدہ چیدہ اشعار درج کریں گے جو وارث شاہ کے اعجازِ فن کے شگفتہ نمونے ہیں :

چاہنے والا کہتا ہے۔ اے میرے محبوب ہم آنکھ کی پتلی کی طرح تجھے اپنی آنکھوں میں جگہ دیں گے ۔ ؎

ساڈیاں اکھیاں دے وچ وانگ دھیری ڈیرا گھت بوہ بل نہ سجناں او

عشق کا بار کندھوں کو شکستہ کر دیتا ہے لیکن عشاقِ صادق اسے اٹھا کر منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاتے ہیں ؎

عاشق جھک کے عشق دی پنڈ سر تے کٹھ منزلاں یار اُتار دے نے

سہتی رانجھے سے کہتی ہے تو مجھے ورغلا نہیں سکے گا میں دوسری جٹیوں کی طرح دل پھینک نہیں ہوں ؎

ہوراں جٹیاں وانگ میں نہیں کچی کی لینائیں جیت بھرمائیکے دے

سہتی رانجھے سے کہتی ہے کہ تیری زبان ایسے چلتی ہے جیسے زمانش پر بنوائے ہوئے جوتے چراچر کرتے ہیں۔ تشبیہ خالص دیہاتی ہے اور خوب ہے اس میں طنز کی ایک دنیا آباد ہے ؎

تیری چراچر پھر کدی جیبھ ایویں جیویں جُتیاں مرکدیاں سایاں دیاں

رانجھا کہتا ہے کہ دولت مندوں کے سبھی دوست ہوتے ہیں بات تو یہ ہے کہ کسی غریب سے پیار کیا جائے ؎

دولت منداں نوں جاندا سب کوئی ہنوں نال غریب دے پالیئے نیں

صحبتِ ناجنس کا ذکر کرتے ہوئے رانجھا کہتا ہے ؂

نال بھوریاں ریشماں میل کیہا ساتھ اُن دے میل کی پُونیاں نے
شتر نال روباہ اہیویں کجھ سعق جیویں نال شہباز چُونیاں نے

ریشم اور بھورے (بالوں سے بنتا ہے) اُون اور سُوت ، اونٹ اور لومڑی ، شہباز اور چِونے (ایک ننھی سی چڑیا) کا کیا میل ؟

وارثؔ شاہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو چیزیں سچا حظ و لطف بخشتی ہیں وہ ہیں :

دھاراں کھانگڑاں دیاں جھوکاں ہاتھیاں دیاں گھول کواریاں تے مزے یاریاں دے

ایک ہی مصرعے میں فلسفۂ حظ و مسرت ؛ سمو دیا ہے۔

گدڑ یا رانجھے سے ہیر کے حسن و جمال کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؂

موجاں مار دا حسن دریا چنّا اُتے بُوغباں آوندا جھگ دائی
چہرہ سُرخ گلاب دے پھل والا وانگ کولیاں شوخیوں لمھ دائی

ہیر کے حسن کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس کے پستان ایسے ہیں جیسے گرداب پر جھاگ کا گالا اُبھر آتا ہے۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کے مانند سُرخ ہے اور انگاروں کی طرح دہک رہا ہے۔

لڑکیوں کی نشتر زبانی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

کڑیاں بولیاں پھیر اِکٹھ کر کے جیبھاں سان تے جا چڑھایاں نے

گدڑیا رانجھے سے کہتا ہے کہ

بُن ہیر گوایکے ہیریا او پیا رووناہیں اسرائیل وانگوں

ہیرا اور ہیریا میں رعایتِ لفظی کا لطف ملاحظہ ہو۔

رانجھے جوگی کا ذکر کرتے ہوئے وارثؔ شاہ کہتے ہیں ؂

کدی سنگلی سُٹ کے شگن واچے کدی سواہ تے اوسیاں پایاں نے

کدی کنگ وجا ئیکے کھڑا رو وے کدی ہسکے ناد گھو کائیاں نے

اس شعر کے تصویری پیکر Image اس قدر اچھوتے اور انداز بیان ایسا انوکھا ہے کہ اس کا مفہوم کسی زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا مصرع خاص طور سے لاجواب ہے۔

صوفیہ وجودیہ کا عقیدہ ہے کہ کائنات کی تکوین ذاتِ مطلق کی صفات سے ہوئی اور صفات ذات سے جدا نہیں ہیں۔ وارث شاہ کہتے ہیں ؎

رانجھے آکھیا خیال نہ پَو میرے سپ شینہ فقیر دا ویس کیہا
کونجاں وانگ ممولیاں دیس چھڈے اساں ذات صفات تے بھیس کیہا

جس طرح کونجیں اور ممولے موسم کی تبدیلی پر ترکِ وطن کرتے ہیں اسی طرح صفات ذات سے جدا ہوئیں لیکن جدا بھی نہیں کیونکہ ترکِ وطن کے باوجود کونجیں اپنے دیس سے وابستہ ہیں کہ لوٹ کر وہیں آتا ہے۔

رانجھا سہتی سے کہتا ہے ع

بدل گڑکے وانگ کیوں گجنی ایں اُڈ گیا ئی شرم وحیا موئیے

جو بادل ادھے برساتا ہے اس کی کڑک بڑی ہولناک ہوتی ہے۔ سہتی کے شور و غل کو اس بادل سے تشبیہ دی ہے کہ غصیلی عورت کی گرج اس سے کم نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول کی آواز اور سامنے کھڑے ہوئے محبوب کا دیدار اچھا ہوتا ہے۔

اگے نظر دے مزہ معشوق دا ئی اتے ڈھول سہاوندا دور جیہا

ملکی اپنی بیٹی ہیر سے کہتی ہے کہ لڑکیوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ جوان مسٹنڈوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی پھریں ع

نال ساہناں دے پھریں دن رات کھیندی تیرا حال ایہو اٹھے پہر دیے نیں

یہ مصرع بھی انہی سے منسوب ہے اگرچہ مجھے ہیر میں دکھائی نہیں دیا ع

وارث شاہ میاں جھوٹی گڈھی جاسی جیہڑی کھیہڑ دی اے نال سنڈیاں دے

وصال کا منظر جب ہیر بے اختیار جوگی کے گلے لگ جاتی ہے ؎

یارو وگی انّھیڑی عشق والی، اُٹھ شرم حیا دی پگ گئی
وارثؔ شاہ رب جوڑ دا جوڑیاں نوں کھب چھاپ اندراج نگ گئی

جب عشق کا طوفان پھٹ پڑے تو شرم کیا اور حیا کیسی۔ یاد رہے کہ زور کی آندھی آئے تو سر سے پگڑی اڑا کر لے جاتی ہے۔ دونوں عشاق بغل گیر ہوئے گویا نگینہ انگشتری میں جڑ دیا گیا۔

ہیر سہتی سے کہتی ہے کہ میں رانجھے کے فراق میں اور تو مراد کی جدائی میں تڑپ رہی ہے۔ کیوں نہ ہم دونوں اپنے اپنے عشاق کے وصال سے شاد کام ہوں اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو جی بھر کے گلے لگائیں ؎

تینوں ملے مراد تے اساں ماہی دوویں اپنے یار ہنڈا سیئے نی
ہووے میل جو چریں وچھنیاں دا یار رج کے گلے لگائیے نی

یار ہنڈانڑاں ایسا محاورہ ہے جس کا مفہوم کسی دوسری زبان میں ادا کرنا ناممکن ہے۔

ہیر کی ساس اپنی بہو کو چپ چاپ اور اداس دیکھتی ہے تو کہتی ہے۔ ع

کوئی گھبڑا روگ ہے ایس دھانا آہیں نال ایہ کڈھدی ساہ کڑیئے

اور اس تمنا کا اظہار کرتی ہے کہ ہیر ع

دلوں گنڈھ کھولے موہنوں ہس بولے کلی دلے دی خاص شگفت ہووے

"گھبڑا روگ" اور "دلوں گنڈھ کھولے" میں جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔

جب ہیر نے بہانہ کیا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے وہ بلی کے بچے کے مانند نحیف آواز میں بولنے لگی ع

بدل ہیر دی گئی آواز زہروں جیہے بولدی بچڑیں بلونگڑا ئی

تشبیہ خالص دیہاتی ہے اور نہایت موزوں اور اچھوتی ہے۔

جوان لڑکیوں کی چال ڈھال اور زلفِ سیاہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کنگی پا ئیکے لٹکدی چال چلن نال چادراں چھیل چھبیلیاں نے
زُلفاں کالیاں ناگناں ٹھرے تے کسی باندی منتراں کیلیاں نے

شوخ و شنگ لڑکیاں ناز و ادا سے مستانہ وار اٹھلا اٹھلا کر قدم اُٹھا رہی ہیں۔ ان کے چہروں پہ سیاہ زُلفیں یوں لگتا ہے جیسے ناگنوں کو منتر پڑھ کر مسخّر کر لیا گیا ہو اور وہ چلتی چلتی تھم گئی ہوں۔

رانجھا طنزیہ سہتی اور رابیل باندی سے کہتا ہے ع

کیہیاں چیندریاں لگیو اج متھے اکھیں ٹھکھ دیاں بھُوت بھنیریاں نے

"بھ" کی تکرار نے لطفِ بیان کو اجاگر کر دیا ہے۔

بالنا تھ کہتا ہے:

تُسیں جٹ اک جھٹ وچ پٹ سٹ دے گھراں وسدیاں گھت پتھاڑیاں نوں

صوتی کیفیت قابلِ داد ہے۔

سہتی رانجھے سے کہتی ہے: ع

ہاتھی وانگ ننگاں تیرا ڈھڈ گپا اُتے سری جاپے صورت ڈٹ دی اے

کسی فربہ اندام شخص پر اس سے زیادہ بھرپور طنز نہیں کی جا سکتی۔

راجے کے سامنے شکایت کرتے ہوئے کھیڑوں نے کہا ع

ایہدیاں سیلیاں ویکھ کے بھُل ناہیں ایہنوں بھِسں اے رناں کھسکا ونیڈا

یعنی اس کے جوگی کے بھیس کو نہ دیکھیے یہ عورتوں کو ورغلانے کا بڑا شوقین ہے۔

وارث شاہ کہتے ہیں کہ عشق کا ذائقہ سخت کڑوا ہوتا ہے لیکن عشاق کے لئے شراب طہور ہے۔

مزہ کوڑا ای عشق دا وانگ تُمے جاپے عاشقاں آب طہور والے

نکتہ پردازی مُلاؤں کی سرشت میں ہے ع

وارث شاہ میاں پنڈ جھگڑیاں دی پچھوں ملاں مسیت دا آیا اے

مُلا کو "پنڈ جھگڑیاں دی" کہنا نہایت بلیغ اندازِ بیان ہے۔

ملکی ہیر کو سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ہم نے تیری ہر طرح ناز برداری کی لیکن
تو نے ہمیں رسوا کیا اور خاندان کی عزت برباد کی۔ ع

نک وڈھ کے کوڑماں گالیوای ایہہ نفع لے لاڈلڈاوتے دا

'کوڑماں گالناں' کے محاورے کا استعمال نہایت برمحل ہوا ہے۔

جب ہیر اور رانجھے کے پیار کا راز کیدو نے فاش کیا تو چوچک نے رانجھے کو ڈانٹ
پلائی۔ رانجھے نے کام چھوڑ دیا۔ بھینسیں جو اس سے مانوس ہو چکی تھیں بے قابو ہو کر ادھر ادھر
بھاگنے لگیں، چوچک سخت پریشان ہوا۔ اس نے ملکی کو رانجھے کے پاس بھیجا کہ اسے منالائے۔
ملکی رانجھے سے کہنے لگی ؎

ملکی آکھدی لڑیوں جے نال چوچک کوئی سخن نہ جیوتے لیاونائیں
کیہا ماپیاں پتراں لڑن ہندا تساں کھٹناں تے اساں کھاونائیں
چھیڑ ماں دے نال میں گھول گھتی مال سانبھ راتیں گھر لیاونائیں
کڑی کل دی تیرے توں رس بیٹھی تو ہیں اوسنوں آن مناونائیں

کہتی ہے ماں باپ اور اولاد کی بھی بھلا کوئی رنجش ہوتی ہے۔ اولاد کماتی ہے ماں باپ
کھاتے ہیں۔ جاؤ ڈھور ڈنگر سنبھالو۔ ملکی پوری 'پھپھے کٹنی' ہے۔ کہتی ہے کہ ہیر کل سے تجھ
سے روٹھی بیٹھی ہے جاؤ اور اسے منانے کی تدبیر کرو۔ یہ سن کر رانجھا بھلا کیا عذر کر سکتا تھا۔

ہیر کی سہیلیوں نے انتقاماً کیدو کی جھونپڑی کو جلا دیا۔ اس کی چیزوں کو توڑ پھوڑ
دیا۔ اسے خوب پیٹا، تو وہ شکایت لے کر چوچک کے پاس گیا اور پکار کر کہنے لگا ع

مینوں مار کے اودھلاں منج کیتا جھگی لاہ سواترا ساڑیانیں

اودھل وہ عورت ہوتی ہے جسے آسانی سے ورغلایا جا سکے۔ پنجابی میں گالی ہے۔ کہتا ہے
کہ ان نابکاروں نے مار مار کر مجھے "منج کر دیا ہے"۔ منج کو بڑی مشقت سے کوٹ کوٹ کر
باریک کیا جاتا ہے۔ نہایت موزوں تشبیہ ہے۔

وارث شاہ کہتے ہیں کہ جوانمرد راز فاش نہیں کیا کرتے ؎

بھیت دسنا مرد دا کم ناہیں مرد سوئی جو ویکھ دم گھٹ جاوے
وارث شاہ نہ بھید صندوق کھلے بھاویں جان دا جندرا ٹٹ جاوے

کہتے ہیں کہ خواہ جان کا تالا ٹوٹ جائے بھید کا صندوق نہیں کھلنا چاہیئے۔ یعنی راز راز رہے خواہ جان چلی جائے۔

لڑکیاں نووارد جوگی کے روپ سے متاثر ہو کر پوچھتی ہیں ؎

سنیں جوگیا گبھرو چھیل بانکے نین کھیویا مست دیوانیاں وے
ایس عمر کی وانڈہ پیا تینوں کیوں بھوناں ایں دیس بیگانیاں وے

پہلے مصرع میں رانجھے کی مست جوانی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

سہتی جوگی سے کہتی ہے ع

گدھے وانگ جاں ربجیوں کریں مستی کھچاں سنگھنائیں رناں پرایاں دیاں

کہتی ہے کہ غیر عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہو جیسے گدھا پیٹ بھر راتب کھالے تو خرمستی کرنے لگتا ہے۔ "کھچاں سنگھنائیں رناں پرایاں دیاں" طنز کے زہر میں بجھا ہوا جملہ ہے۔

عشق کا شعلہ بھڑک اُٹھے تو اُسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ ع

لاٹ رہے نہ جیوں دے وچ لکی ایہہ عشق الغبرا اگ دا ای

معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ کے زمانے میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت پائی جاتی تھی۔ کہتے ہیں ع

وارث شاہ جیوں سنکھیا چوہیاں نوں سنکھ ملاں تے بانگ براہمناں نوں

سنکھیا چوہے کے لئے زہر ہے کہتے ہیں کہ یہی اثر سنکھ کی آواز ملا پر اور اذان برہمن پر کرتی ہے۔

سہتی رانجھے سے کہتی ہے ؎

گر تتراں دے انھاں باز چھٹا جا چمڑے دا ندیاالواں نوں
گھلیا پھل گلاب دا توڑ لیاویں جا چمڑے توت سنبھالواں نوں

طنز میں بے پناہ نشتریت آگئی ہے. کہتی ہے تیری مثال اس اندھے باز کی سے جسے تیتر پکڑنے کے لئے اُڑایا جائے اور وہ کسی بیل کے خصیتین سے جا کر چمٹ جائے ۔ یا کسی کو گلاب کا پھول توڑنے کے لئے بھیجا جائے اور وہ توت کے درخت کا رُخ کرے ۔

ان جستہ جستہ مثالوں سے کلامِ وارث شاہ کے محاسن کا احاطہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نازنین پری تمثال کے چاک گریباں سے اس کے بدن کی گوناگوں لطافتوں کا اندازہ لگانا یا رخنۂ دیوار سے کسی باغِ رشکِ جناں کی رنگینیوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنا ۔ ہیر وارث شاہ میں غواصی کئے بغیر اس سے کما حقہٗ لطف اندوز ہونا از قبیل محال ہے کہ اس کے ایک ایک شعر میں حظوظ و معانی کی ایک دنیا آباد ہے ۔

وارث شاہ کا علم و فضل

وارث شاہ جامع کمالات تھے۔ ہیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ و سیر پر عبور کامل تھا۔ تصوف و عرفان کے اسرار و رموز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ طب، علم نجوم اور موسیقی سے بہرہ ور تھے۔ عربی، فارسی، ہندی اور پشتو جانتے تھے۔ یوگ ویدانت، پرانوں اور ہندو دیومالا کا وقوف رکھتے تھے۔ ہیر میں کثرت سے علمی تلمیحات دکھائی دیتی ہیں، جو اس امر پر شاہد ہیں کہ وارث شاہ لوک بَت کہاد۔ لوک کہانیوں اور لوک سنگیت سے بخوبی واقف تھے۔ اس پہلو سے ہیر گنجِ شائگاں سے کم نہیں۔ جس میں پورے عہد کے دیہاتی اور عوامی کلچر کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ شاعر کے لئے عالم و فاضل ہونا ضروری نہیں ہے لیکن جب ملکۂ شعر گوئی کے ساتھ علمیت و تفکر مشمول ہوں تو شعر میں بیش از بیش وسعت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ نظامی گنجوی، عمر خیام، دانتے، گیٹے، ملٹن، ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے کلام میں تلمیحات کی فراوانی ہے۔ لیکن اس سے شعر کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلکہ اس کی کشش میں اضافہ ہوا ہے۔ وارث شاہ کا شمار بھی اسی زمرے میں ہوگا۔ ان شعرا کو بعض اوقات یہ دقت درپیش ہوتی ہے کہ ان کی شاعرانہ آمد، اظہار کی بے ساختگی اور علمیت ایک دوسرے کے معارض ثابت ہوتے ہیں علمی تبحر اظہار کی بے ساختگی کو مجروح کرتا ہے اور

لے ہیر وارث شاہ میں پٹھان عورتیں پشتو اور ایرانی عورتیں فارسی بولتی ہیں۔

شاعرانہ آمد علمیت کی ثقاہت کو برقرار نہیں رہنے دیتی۔ جو شعرا، اس مشکل پر قابو پالیتے ہیں وہ فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ وارث شاہ کی علمیت میں شعر کی رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔ اور علمیت نے شاعری کو توانائی بخشی ہے۔ وارث شاہ کو خود بھی اپنی علمیت کا احساس تھا اور وہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ

وارث شاہ میاں تیرا علم ہویا مشہور وِچ جِن تے اِنس طیریں

کہتے ہیں کہ میں نے بخیلوں کی طرح اپنا علم سینت سینت کر نہیں رکھا بلکہ اس دولت کو برسرِ عام لٹا دیا ہے۔ ؎

حسد بخل نہ کسے دے نال کیتا جیو کسے دا نہیں ستایا ئی
علم اپنے دا حصہ ونڈ دِتا نا ہیں شُوم کنجوس سدایا ئی

سب سے پہلے ہم وارث شاہ کی تلمیحات کو لیں گے۔ وارث شاہ نے اُن تلمیحات کا ذکر کیا ہے جو فارسی شاعری کے واسطے سے اُردو، سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی شاعری میں لغو ذکر گئیں۔ ان کے یہاں بھی شیریں فرہاد، لیلے مجنوں، عذرا وامق، زلیخا مثالی عشاق ہیں۔ جو اپنی زندگیاں عشق و محبت کی بھینٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ملکی عشاق کا ذکر بھی احترام اور عقیدت سے کرتے ہیں۔ ان میں سوہنی مہینوال، نل دمینتی، سسی پُنّوں خاص سے طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ بعض تلمیحات ایسی بھی ہیں جو آجکل کے قارئین کے لئے بعید از فہم ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر ہم ذیل میں کریں گے۔

۱۔ امیر بائی : بائی بلوچستان کے ایک سردار مصری خاں کی بیوی تھی جس پر امیر خاں عاشق ہوگیا۔ بائی بھی اس سے پیار کرنے لگی۔ اس معاشقے کا انجام فرحیہ ہوا۔

۲۔ جام کوراں : ایک بلوچ احمد نامی کا معاشقہ ایک ہندو عورت کوراں سے ہوا۔ دونوں کا انجام دردناک ہوا۔

۳۔ ڈھول ماروآں : ڈھول ایک شہزادہ تھا جس نے اپنی منگیتر ماروآں کو دغا بتا دی ماروان کا انجام دردناک ہوا۔

۴۔ روڈا جلالی : علی گوہر عرف روڈا شاہِ بلخ کا بیٹا تھا جو ہندوستان آیا اور ایک لوہاری جلالی پر فریفتہ ہو گیا۔ راز فاش ہوا تو لوہاروں نے روڈا کو جان سے مار دیا۔ جلالی اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوئی۔

۵۔ کامروپ کام لٹاں : کامروپ ایک راجکمار تھا جو کام لٹاں پر عاشق ہوا۔ بڑے بڑے مصائب جھیلنے کے بعد حصولِ مراد میں کامیاب ہوا۔

۶۔ کیما ملکی : مرزا انور علی بیگ عرف کیما ایران کا ایک سوداگر بچہ تھا جو چنیوٹ کے ایک قصاب کی بیٹی ملکی پر عاشق ہو گیا۔ ملکی بھی دل و جان سے اسے چاہنے لگی اور دونوں چھپ کر ملنے لگے۔ راز فاش ہونے پر قصابوں نے کیما کو ذبح کر دیا اور ملکی کو زہر دے کر مار ڈالا۔

۷۔ معیار چندربدن : معیار ایک سوداگر بچہ تھا جو راجکماری چندربدن پر عاشق ہو گیا اور اس کی جدائی کی تاب نہ لا کر رہگرائے عالم بقا ہوا۔ چندر بدن بھی اسکی جدائی میں مر گئی۔

ان کے علاوہ گل صنوبر، بدرِ منیر بے نظیر، گل بکاؤلی، ترنج بھول رانی، شاہ پری بہرام وغیرہ افسانوں کی تلمیحات ملتی ہیں اور ایسے مشاہیر کا ذکر آتا ہے جن سے قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ مثلاً بہلول دانا (عہد ہارون الرشید)، بلعم بعور (عہد نامہ قدیم) گورکھ ناتھ جو بالناتھ کا گرو تھا۔ وشوامتر (ایک کھتری جو یوگی بن گیا) بھرتری (راجہ بکرماجیت کا بھائی جو شاعر تھا) بھگت کبیر، راجہ رسالو (پورن بھگت کا بھائی) رانی سندراں (پورن سے ناکام پیار کرنے والی) شیخ صنعان (ان کا قصہ شیخ عطار نے نظم کیا ہے) سُتھرا (پیرو بابا نانک) جو شاعر بھی تھا (اس کا ایک مصرع ضرب المثل بن گیا ہے۔ ع (کوئی مرے کوئی جیوے ستھرا گھول بتاسے پیوے)

وارث شاہ نے مختلف اقوام کے پیروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ راجہ نل (دمینتی کا عاشق) جواریوں کا پیر ہے۔ لال شہباز ملنگوں کے۔ شاہ مدار مداریوں کے۔ شیخ ٹیرا (اصل نام ظہیر) موچیوں کے

ماگھی تراسیوں کے۔ علی رنگریز رنگریزوں کے۔ سلیمانؑ نائیوں کے۔ رشو مالی کشمیریوں کے۔ جسو تیلیوں کے۔ گگلو کمہاروں کے۔ ناما دھوبیوں کے پیر ہیں۔ وارث شاہ نے ہندوؤں کی کتب پران وغیرہ پڑھی تھیں جن کے حوالے سے انھوں نے چوراسی بدھ (نیک لوگ)۔ باون بیر چونسٹھ جوگنی (بلائیں)، چھ جتی (پاکباز) دس رس (پانچ حواس ظاہری پانچ باطنی)۔ پنج بھوت (عناصر) وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

وارث شاہ نقلی و عقلی علوم کے فاضل تھے۔ عربی کی درسی کتابوں میں انھوں نے 'تعلیل میزان'، 'صرف بہائی'، 'صرف کنز الاقواع' 'خانی' 'حیرت الفقہ' 'فتاویٰ'۔ 'معارج النبوۃ'۔ 'شرح ملا زنجانی' کے نام لئے ہیں۔ فارسی کی مشہور کتابوں میں گلستان، دیوان حافظ، بہار دانش، طوطی نامہ دفتر ابو الفضل، بدر چاچ (دیوان) شاہنامہ۔ قران السعدین، شیریں خسرو، سکندر نامہ، دیوان خسرو، انوار سہیلی وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ طب کی جن کتابوں کے نام لئے ہیں ان میں میزان الطب، طب اکبر، طب یوسفی، قرابا دین قابل ذکر ہیں۔ امراض میں سودا، مرگی، قولنج، تپ دق، سل نفخ، استسقا، محرقہ، برص، جذام، باد فرنگ، پتھری وغیرہ کے علاج تجویز کئے ہیں۔ اس کے ساتھ ذہنی امراض کے ٹونے ٹوٹکے بھی بیان کئے ہیں اور آسیب کے دفعیہ کے طریقے بتائے ہیں۔ ہندوستان میں سانپوں کی مختلف قسموں کی پہچان اور ڈسنے کا علاج کرنا ایک خاص علم تھا۔ وارث شاہ نے سانپوں کی تیس قسموں کے نام لئے ہیں۔ باشک، ناگ۔ کرنڈیا۔ بھجنگ۔ تیترا۔ کلغی وار۔ پھنیر، بھونڈیا۔ مرل کھرل۔ تندوڑا۔ بوڑا۔ پتی۔ دومیرا۔ کھرنیا۔ جلیبیا۔ تیلیا۔ سنگتا۔ پرچیلا۔ اڈنا۔ کاندیر۔ جکنا۔ کھجوریا۔ چنیڑا۔ لنکوریا۔ کجلیا وغیرہ۔

وارث شاہ علم موسیقی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ چھ بڑے راگوں کا ذکر کرتے ہیں: بھیروں مالکوس۔ ہنڈول۔ سری۔ دیپک اور میگھ۔ ان کے ساتھ انھوں نے ہاجہاں اور تیرا کا نام بھی لیا ہے۔ ان اصطلاحات کی تشریح کے لئے اس بات کو ذہن نشین کر لینا ضروری

لہ ایران میں نائی کو سلیمانی یا سلمانی کہتے ہیں۔

ہے کہ راگ مرد ہے راگنی اس کی زوجہ ہے۔ چھ راگ ہیں ہر راگ کی پانچ پانچ راگنیاں ہیں آٹھ آٹھ پتر (بیٹے) اور آٹھ آٹھ بہویں ہیں۔ بہو کو بھارجا کہتے ہیں۔ جو وارث شاہ کے یہاں بھاجاں ہیں۔ یہ بات مثال سے واضح ہوگی۔

سری راگ : اس کی راگنیاں ہیں اساوری۔ بسنت وغیرہ۔ اس کے پتر ہیں کھٹ۔ دیس کار۔ راگیشری وغیرہ اور بھارجائیں ہیں سوہنی وغیرہ۔

وارث شاہ نے مندرجہ ذیل راگنیاں پتر اور بھارجائیں گنائی ہیں۔

سارنگ۔ شہانہ۔ سورٹھ۔ سوہنی۔ تلنگ۔ گجری۔ پوربی۔ للت۔ بھیم پلاسی۔ بھیروی۔ دھناسری۔ اساوری۔ ٹوڈی۔ گونڈسری۔ جیت۔ مالسری۔ پرج۔ ماروا۔ کدارا۔ بھاگڑا۔ مارو۔ کانڑا۔ جنگلہ کلیان۔ بدھنس۔ نٹ۔ بروا۔ جھنجھوٹی۔ آسا۔ بسنت۔ رام کلی۔

وہ اودب۔ کھورب کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ یہ اروہی، اوروہی ہیں۔ اروہی کھرج سے نکھاد تک کے سروں پر مشتمل ہوتی ہے اور اوروہی اس کے الٹ نکھاد سے واپس کھرج تک کے سروں پر۔ مثلاً بھیروی کی اروہی ہے سا رے گا ما پا دھا نی۔ اس کی اوروہی ہوگی نی دھا پا ما گا رے سا۔ یہ راگنی سمپورن ہے۔ (وارث شاہ نے اسے سنپور لکھا ہے) یعنی سات سروں پر مشتمل ہے۔ وارث شاہ نے ایک جگہ گرام کا بھی ذکر کیا ہے

سپتی سر رلائیکے ونجلی نوں انگلی پور گرام رکھا وندائی
کھرب۔ رکھب۔ گندھار۔ مدھم۔ پنجم۔ دھیوت آتے نکھاد بلا وندائی

گرام کا معنیٰ ہے گاؤں یا سفر کے دوران میں کسی جگہ آرام کیلئے ٹھہرنا۔ موسیقی میں اس کا دوسرا مفہوم لیا جاتا ہے۔ گرام تین ہیں۔ کھرج گرام۔ مدھم گرام اور نکھاد گرام۔ ہر گرام کے سات مورچھنا ہیں۔ گویا تین گرام کے اکیس مورچھنا ہوئے۔ ایک مورچھنا کھرج وغیرہ سے آغاز کر کے اگلے ساتویں سر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور ساتویں سر سے بطرز اوروہی واپس لوٹتا ہے۔ اوپر کے شعر میں وارث شاہ کہتے ہیں کہ رانجھے نے سپتک کا تعین کر کے ونجلی بجانے کا ارادہ کیا۔

سپتک تین ہیں۔ مندر۔ مدھ۔ تار۔ سپتک کو استھان بھی کہتے ہیں۔ سپتک یا استھان سات سروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

صوفیہ وجودیہ راگ کو روح کی غذا کہتے ہیں الغنا غذا الارواح۔ وارث شاہ کہتے ہیں۔

خورش روح دی راگ اے ایہ کہن عاشق روح راگ قلبوت دے وچ سلیائی

محرم عشق دا کہن سرود ہندا جنہاں راہ سلوک دا لیائی

راگ کا تعلق عشق و محبت سے ظاہر ہے۔ راگ جذبۂ محبت میں تہیج اور وارفتگی پیدا کرتا ہے۔ دردِ فراق کو زبان عطا کرتا ہے اور وصل کی لذت میں اہتزار پیدا کرتا ہے۔ قدماء بجا طور پر راگ اور خوشبو کو عشق کے لوازم سمجھتے تھے۔

وارث شاہ جوگ کے مبادی و اصول سے بھی واقف ہیں۔ جوگ۔ یوگ۔ یا یوگا کا لغوی معنی ہے 'جُوا' جو بیلوں کو جوتتے وقت ان کی گردنوں پر رکھتے ہیں۔ پنجابی میں یہی لفظ جوغ ہے۔ اور یونانی اور انگریزی میں Yoke ہے۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے نیک اعمال سے اندریوں (حواس مدرکہ) پر قابو پانا۔ اور لوبھ (لالچ) کام (شہوت) کرودھ (حسد۔ جلن) اور اہنکار (خودی کی گرفت) سے چھٹکارا پالینا۔ شو یا مہادیو کو جوگ کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ وارث شاہ نے یوگ کے بڑے بڑے مسالک اور ان کے بانیوں کا ذکر کیا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں نجات یا نروان حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔ سانکھیہ (علم) یوگ (عمل) بھگتی (عشق)۔ گیتا میں یوگ کی دو قسموں کا ذکر آیا ہے۔ کرم یوگ اور بھگتی یوگ۔ کپل منی نے سانکھیہ شاستر میں پُرش (روح) اور پرکرتی (ہیولی) کی دوئی کا ذکر کیا ہے "گیتا" میں سانکھیہ کا لفظ ویدانت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اپنشدوں کے نظریے کی عملی ترجمانی کی گئی ہے۔ شری کرشن کہتے ہیں :

" جو مجھ کو سب میں اور میرے میں سب کو دیکھتا ہے اس یوگی سے میں دور نہیں ہوں اور وہ مجھ سے دور نہیں ہے۔ " (گیتا)

" جسے آتما اور برہم کی ایکتا کا کامل گیان ہے وہ اپنے آپ کو برہم سروپ محسوس کرتا ہے۔ " (گیتا)

وارث شاہ ہمہ اوست کے قائل تھے اور نظریۂ ہمہ اوست اور ویدانت میں مماثلت

کو پہچانتے تھے ؎

بتّے سُنو اس وچ قلبوت خاکی سچّے رب نے ٹھاؤں بنایا ئی

وارث شاہ میاں ہمہ اوست جانے سرب ہوئے بھگوان وسایا ئی

بعض مقامات پر تو "گیتا" کے اشلوکوں اور وارث شاہ کے اشعار میں توارد ہوگیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ نے گیتا کا مطالعہ کیا تھا۔ شری کرشن کہتے ہیں :

"یہ ساری دنیا مجھ میں اس طرح پروئی ہوئی ہے جس طرح دھاگے میں منکے پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔" "گیتا"

پھر کہتے ہیں :

"میں پانی میں رس، چاند سورج میں روشنی، ویدوں میں اوم کار، فضا میں آواز، مردوں میں مردانگی، مٹی میں خوشبو، آگ میں چمک، جانداروں میں جان، تپ کرنے والوں کا تپ جانداروں کا قدیم بیج، عقل مندوں کی عقل، جلال والوں کا جلال ہوں۔" "گیتا"

وارث شاہ کہتے ہیں ؎

مالا منکیاں دے وچ اک دھاگا تیوں سرب کے بیچ سما رہیا

سبھا جیوندیاں وچ ہے جان وانگوں نشہ بھنگ افیم وچ ہے آ رہیا

جیویں مہتریں مہندیوں رنگ رچیا تیویں جان میں جان رچا رہیا

جویں رگت سریر وچ سانس اندر تویں جوت میں جوت دکھا رہیا

کس قدر خوبصورت انداز بیان ہے کہتے ہیں کہ وجودِ مطلق کائنات میں اس طرح مخفی ہے جیسے مہندی کی سبز پتیوں میں سرخ رنگ اور بھنگ اور افیم میں نشہ مخفی ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو رانجھے کی زبانی بیان کرتے ہیں ؎

سُنیں سجنیے ایس جہان اُتے رب کئی پسار پسار دائی

قدرت نال خواہش خاص اپنی دے رنگارنگ ڈیاں صورتاں ڈھادائی

بالنا تھ راجھے سے کہتا ہے کہ پانچ بھوتوں (پانچ اندریوں) کو قابو میں لانا ضروری ہے اور کام، لوبھ، کرودھ، اہنکار کی زنجیروں سے آزادی پانے کی کوشش کرتا ہے۔

پنج بھوت بیگار تے ارد باقی نال صبر سنتوک دے پوریئے جی
اوہ پرکھ نربان پد جا پہنچے پانچوں اندریاں جنہاں نے ماریاں نے
کام، کرودھ تے لوبھ ہنکار مارن تن خاک دیوچ رلاونا اے

جہاں تک تصوّف و عرفان کا تعلق ہے وارث شاہ خود صاحبِ حال صُوفی تھے۔ اس بحر کے شناور تھے اور سلوک کے مقامات سے آشنا تھے۔ وہ وحدت الوجود یا ہمہ اوست پر محکم عقیدہ رکھتے تھے۔ ع

وارث شاہ یقین دی گل ایہا سبھا حق ہی حق ٹھہرایئے جی

وحدت الوجود کا عقیدہ فلسفے سے تصوّف میں آیا تھا۔ سب سے پہلے الیاطی فلاسفہ نے اسے مُدلّل انداز میں پیش کیا۔ بعد میں رواقیّین اور فلاطینوس نے اپنے اپنے رنگ میں اس کی ترجمانی کی۔ فلاطینوس اور اس کے پیرؤوں کے افکار سریانی زبان کے تراجم کے ساتھ عربی میں منتقل کیے گئے۔ فلاطینوس کا مرکزی خیال فصل و جذب کا تھا۔ یعنی روح ذاتِ بحت سے بہ ارج جدا ہو کر مادے کے جال میں اسیر ہو گئی ہے اور اس قید سے رہائی پا کر دوبارہ اپنے مبدء میں واصل ہو جاتی ہے۔ صُوفیہ نے ذاتِ بحت کو محبوبِ ازلی یا محبوبِ مطلق کا نام دیا۔ جس کے فراق میں روح تڑپتی رہتی ہے۔ روح کی اس تڑپ اور اضطراب و التہاب کو عشق کہا گیا۔ دنیائے اسلام میں حضرات ذوالنّون مصری، ابراہیم ادہم، جنید بغدادی، بایزید بسطامی، منصور حلّاج وغیرہ نے تصوّف کی روایات قائم کیں، سلوک کے مقامات کی تعیین کی اور مجاہدۂ نفس کے آداب بتائے۔ عربی کے شاعر ابن الفارض اور فارسی شعرا سنائی، عطار، عراقی، رومی، حافظ وغیرہ نے اپنی شاعری میں اس جوش و خروش سے عشقِ حقیقی کے مضامین مجازی پیرائے میں بیان کیے کہ تصوّف گھر گھر پھیل گیا۔ ابن الفارض مشہور وجودی صوفی

شیخ اکبر ابن عربی کے شاگرد تھے اور رومی صدرالدین قونوی کے واسطے سے ابن عربی کے افکار سے متاثر ہوئے تھے۔ چشتیہ صوفیہ نے وجودیت پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی اور اس کے حوالے سے خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفار نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی۔ جیسا کہ ڈاکٹر تارا چند نے کہا ہے بھگتی کی تحریک پر مسلمان صوفیہ کے نظریات نے گہرے اثرات ثبت کئے تھے۔ اس ضمن میں بھگت کبیر اور گورو بابا نانک خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری طرف مسلمان صوفیہ نے ویدانت کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُن کے وحدت الوجود یا ہمہ اوست اور ویدانت کی "آتما برہم ایکتا" یا "ہر میں ہر" کا نظریہ حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں۔ دارا شکوہ، مظہر جانجاناں اور صاحبِ دبستانِ مذاہب نے اس مماثلت کا ذکر کیا ہے۔ فارسی شعرار کی طرح اُردو میں میر درد، سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، پشتو میں رحمان بابا اور پنجابی میں خواجہ فرید نے وجدآور اسالیب میں وحدت الوجود اور عشقِ حقیقی کے مضامین پیش کئے ہیں۔ شاہ حسین، غلام رسول، بلھے شاہ علی حیدر ملتانی، سلطان باہو، میاں محمد پنجابی کے سربرآوردہ صوفی شاعر ہیں۔ یاد رہے کہ پنجابی کے پہلے شاعر بابا فرید شکر گنج مشہور صوفی تھے۔ ان کے اشعار "گورو گرنتھ صاحب" میں محفوظ ہیں۔ پنجابی شاعروں نے رانجھے اور پنوں کو محبوبِ مطلق کی علامت قرار دیا اور سسّی اور ہیر روح کی علامتیں بن گئیں۔ جو اپنے مبدر میں واصل ہونے کے لئے ہر وقت بے قرار رہتی ہے شاہ حسین کا شعر ہے ؎

جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی رانجھن میرے سنگے
نہیں آیاں میرا چاک نہ آیا ہیر کوکے وچ جھنگے

ہیر کی اس نالہ نالی سے مولانا روم کی نَے یاد آجاتی ہے جو اپنے نیستاں کے فراق میں نالہ کناں ہے۔

غلام قادر شاہ بٹالوی فرماتے ہیں ؎

آپ ہیر تے آپے رانجھن آپے جیونوں سُلّے
آپ مہیں تے آپے ماہی آپے جھل اُدّلے
آپے جھنگ تے تخت ہزارہ آپے بیلے بلّے
کہے غلام ایہہ سوئی جانڑیں جن پکڑے میراں دے پلّے

یہ وہی خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ یا " ہر میں ہر" کا مضمون ہے۔
بُلّھے شاہ کہتے ہیں ؎

ہیر رانجھے دے ہوئے میلے | بھولی ہیر ڈھونڈیندی بیلے
رانجھا یار بکل وچ کھیلے | سُدھ نہ رہیا سُرت سنبھال

عشق دی نویوں نویں بہار

وہ برملا ہمہ اوست کا درس دیتے ہیں ؎

اِک لازم بات ادب دی اے | سانوں بات معلوم سب دی اے
ہر ہر وچ صورت رب دی اے | کِتوں ظاہر کِتوں چھپیندی اے

وارث شاہ بھی عشق کی ہمہ گیر کارفرمائی کے قائل تھے۔ ؎

خاک بھکیاں تند دا سواد آوے مزہ عشق دی ایہہ تاثیر دائی
جنہاں مرشداں عشق دا راز مشکل جویں راہ وچ حال ضریر دائی
عشق وچ بڑیاں تلک بازیاں نے ایتھے حوصلہ پست ضمیر دائی
عشق عاقلاں دی مت ماردیندا لکھے حکم ایہہ خاص تقدیر دائی
ناگن زلف محبوب دی ڈنگیاں دا حال نہیں اصلاح پذیر دائی
چھڈناں یار نوں تکناں طرف غیراں گوشت کھاوناں جویں خنزیر دائی

جیسا کہ ہم پہلے باب " عشق و فسانۂ عشق " میں تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، صوفیۂ وجودیہ کی طرح وارث شاہ کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ عشق کے باعث تکوینِ کائنات و تخلیقِ آدم ہوئی تھی۔

روزِ ازل کو "الست" لوبلی کہہ کر روح نے جو میثاق باندھا تھا وہ اس کی پابند ہے لہذا عشق کو نوشتۂ تقدیر سمجھا جا سکتا ہے۔

وارث شاہ بھی قدماء کی طرح جناب امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کو قطبِ اوّل تسلیم کرتے ہیں ؎

علیؑ وچ ولیاں آہا قطب گویا کول جھیک دے نے فرقدین دونوں
ویکھ پاک جمال زہال ہوندے وتے رات پیارے والدین دونوں

اور جناب امیرؑ کے نام کے وِرد کو ضروری سمجھتے ہیں ؎

ذکر کروائی بیٹھ کے وِچ گوشے کیہا بانگڑی نال ادا وڑیا
کردے وِرد خفی جلی علیؑ والا بھید اپنا آپ چھپا وڑیا

وارث شاہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ٹھیک اپنے نفس نوں جان لینا ایہو رب دا راہ پچھانتا ئی
جس نے اپنے نفس نوں جانیا ناں اوس رب نوں کی سہانتا ئی

ہر کہیں محبوبِ ازل کے جمالِ جہاں آرا کی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں ؎

سُنیں سپتیئے ایس جہان اُتے رب کئی پسار پسار دائی
قدرت نال خواہش خاص اپنی دے رنگا رنگ دیاں صورتاں دھار دائی

ذات صفات کے بھیس میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے ؎

کونجاں دانگ ممولیاں دیس چھڈے اساں ذات صفات تے بھیس کیہا

چنانچہ حسینوں کے جمال میں بھی حسنِ ازل کے جلوے منعکس ہوئے ہیں ؎

درشن ہیر سندا درشن رب دائی درشن پائیکے تے امتحان کیجے

بالکے بیں اس صنعتِ صانع کی دید پر فخر کرتے ہیں ؎

بنایا آپ خالق حسن ہیر دے نوں خیال دل احسان عفران کیجے

ایس حسن دی دید جے ہووے قسمت شکر لکھ کروڑ منّاں کیجے

وارث شاہ حبسِ دم کا بھی ذکر کرتے ہیں ؎

ھُمّ ھُمّ ہو کے ساس گھٹ کے تے انگ ڈانگ تپنگ جلاونے ہاں
دسویں دوار تے ساس چڑھائیکے تے بنتا اپنی منوں منا ونے ہاں

عالمِ بے بقا کا ذکر کیسے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے ؎

وارث شاہ دساہ کی زندگی دا ساڈی عمر ہے نقش پتاسیاں دے

اور کہتے ہیں کہ روحِ انسانی اسیر ہو کر رہ گئی ہے ۔ ؎

وارث شاہ جیوں شہد وِچ پھسے مکھی بندہ جگ وچ آکے پھاسدائی

صوفیہ اور فقہار کی مخاصمت اور چپقلش شروع سے موجود ہے۔ فقہار مذہبی احکام کی ظاہری پابندی کو کافی سمجھتے ہیں۔ جب کہ صوفیہ تزکیۂ قلب پر زور دیتے ہیں۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ ملّا اور فقہار ریاکار اور زہد فروش اور ہوس پیشہ دنیادار ہیں۔ ملّا کہتے ہیں کہ صوفیہ ملحد ہیں۔ الحاد و زندقہ کے الزام میں کئی صوفیہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ صوفیہ ذاتِ باری کو محبوبِ ازلی سمجھتے ہیں اور پُر جوش انداز میں اس سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ فقہار کہتے ہیں کہ ذاتِ باری ہماری محبت سے بے نیاز ہے اور ہمارے لئے اس کی اطاعت کافی ہے۔ فقہار خدا کو کائنات سے ماورار مانتے ہیں اور صوفیہ کیرک گرد کی طرح اس کے ساتھ شخصی، جذباتی رشتے قائم کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ظاہر و باطن یا تصوّف و فقہ کی اس کشمکش کی جھلکیاں صوفی شعرار کے کلام میں دکھائی دیتی ہیں۔ پنجابی شعرار نے بھی فقہار کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے اور ظاہری رسومِ عبادت کی ادائیگی کو ناکافی سمجھا ہے۔ سلطان باہو کا شعر ہے ؎

خالص نیل پرانے اُتے نہیں چڑھدا رنگ مجیٹھی ہُو
قاضی آن شرع دل باہو کدی عشق نماز نہ نیتی ہُو

شاہ اشرف بٹالوی فرماتے ہیں ؎

اک دیدار راہی دے اُتوں   میں واری لکھ سو حجاں

بُلھے شاہ کا ارشاد ہے ؎

جہاں میں سبق عشق دا پڑھیا   مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا   جتھے وجدے ناد ہزار
عشق دی نویوں نویں بہار

وید قرآن پڑھ پڑھ تھکے   سجدیاں کر دیاں گھس گئے متھے
نہ رب تیرتھ نہ رب مکے   جس پایا تس نور جمال

پھر کہتے ہیں ؎

حاجی لوک مکے نوں جاندے اساں جاناں تخت ہزارے
جت وَل یار اُتے دل کعبہ بھاویں ویکھ کتاباں چارے

یہ مضمون وارث شاہ کے ہاں بھی جا بجا ملتا ہے۔ ہیر قاضی سے کہتی ہے:۔

ع درس عشق دی واقفی نہیں تینوں پڑھ چھڈیو یا سپاریاں نوں
ع درس عشق دی واقفی نہیں اونہاں طوطے وانگ پڑھن سپاریاں نوں

ان کے ہاں عشق شرع پر فضیلت رکھتا ہے۔ ع

شاہ عشق تے شرع وزیر اُس دی چوکی تھانے تے ضلع تحصیل یارو

عوامی شاعر ہونے کی حیثیت سے وارث شاہ نے ان روایات و توہمات کا ذکر بھی کیا ہے جن پر آج بھی ہمارے دیہاتی محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان میں پنج پیروں[1] کی روایت خاصی دلچسپ ہے۔ پنجابی کے دوسرے شاعروں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ مقبل کی ہیر میں ہے

---

[1] خواجہ خضرؑ فرید گنج شکرؒ۔ لال شہباز قلندرؒ۔ سید جلال بخاریؒ۔ بہاء الدین زکریاؒ۔

خواجہ خضر رومال شکر گنج دِتا اُتے مندرا لال شہباز نوری
خنجر سید جلال بخاری دِتے نے کھونڈی زکریے پیر تے مجھ بوری۔

تریخ پیراں نوں رانجھے نے یاد کیتا پاٹے کن درست کراوندائی

پیلو 'مرزا صاحباں' میں کہتا ہے :

مرزے کلیاں کڈھیاں پنجے پیر منا

ہیر وارث شاہ میں ان کا ذکر کثرت و تواتر سے آتا ہے۔ ہیر اور رانجھے کے آغاز عشق میں پنج پیر بیلے میں رانجھے کے سامنے نمودار ہوتے ہیں اور اسے اطمینان دلاتے ہیں کہ خاطر جمع رکھو۔ ہیر تمہیں بخش دی گئی ہے۔

بچہ کھا چوری چوچ مجھ پوری جیو وچ نہ ہو دلگیر میاں
رب کاج سوارسی آپ تیرے ہوئی تدھ دی نیک تقدیر میاں

ہیر اپنی ماں سے کہتی ہے :

پنجاں پیراں بخشائیکے رب کولوں دتا ہیر دی جھولڑی ڈال مائے
میل یار دا نام معراج ہویا کھول ویکھ قرآن دی فال مائے

یہی بات پنج پیر رانجھے سے بھی کہتے ہیں :

بیڑا پار تینیں رب فضل کرسی کیوں ہویا ئیں ایڈ زہیر میاں
بخشی ہیر درگاہ تھیں تدھ تائیں بخشی تدھ دی سب تقصیر میاں

یاد رہے کہ جب حسن کی دیوی افرودایتی کے حق میں فیصلہ کرکے پیرس نے اسے سنہری سیب دیا تھا تو افرودایتی نے پیرس سے کہا تھا کہ میں تجھے دنیا کی حسین ترین عورت ہیلن بخش دوں گی۔ یہاں تقصیر سے مراد جنسی مواصلت ہے جس نے ہیر اور رانجھے کو رشتۂ محبت میں مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ پھر کہتے ہیں :

رانجھا ہیر دا تے ہیر رانجھے دی موتی لعل دے نال پراونائیں
رانجھے ہیر اتے مہربان ہوکے پنجاں پیراں دا ایہہ فرماونائیں

ہیر کی شادی کے بعد رانجھے کی اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ میرا تیرا نکاح

تو پنج پیروں نے پڑھا دیا تھا۔ اس نکاح پر نکاح پڑھنا خلافِ شریعت تھا۔ ؎

پنجاں پیراں نے تیرا نکاح پڑھیا حکم خاص اللہ دا ہو رہیا
اوس نکاح تے ہور نکاح پڑھنا سُنّت نبی دی کھوُہ ڈبو رہیا

ادبیاتِ عالم کے طلبہ جانتے ہیں کہ مختلف اقوام کے شاعروں اور تمثیل نگاروں نے قصے کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے مافوق الطبع عناصر کا سہارا لیا ہے۔ "ہیملیٹ" میں بادشاہ کا بھوت جو شہزادے سے باتیں کرتا ہے۔ کالی داس کی "شکنتلا" میں انگوٹھی کی گمشدگی اور دشینت کے حافظے کا زائل ہو جانا۔ "میکبتھ" کی چڑیلوں اور "فاوسٹ" کے میفسٹوفلیس کی صورت میں نفسِ انسانی کی کیفیات و واردات متشکل ہو گئی ہیں۔ پنج پیروں کی توجیہہ اس نقطۂ نظر سے کی جائے تو ہیر اور رانجھا ان کا نام اپنی جنسی مواصلت کے جواز کے لئے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم سے تقصیر ہوئی ہے لیکن پنج پیروں نے ہمارا یہ قصور معاف کر دیا ہے۔ بلکہ قصور ہی معاف نہیں کیا ہمارا نکاح بھی کر دیا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں بعض لوگ بغیر نکاح کے جنسی تعلق قائم کرنا چاہیں تو "تن بخشائی" سے جواز کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وارث شاہ کی ہیر میں یہ جواز پنج پیروں کے حوالے سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بات رانجھے جیسے کائیاں جاٹ سے بعید نہیں تھی کہ وہ اس غرض کے لئے پنج پیروں کا نام لیتا۔ اس پہلو سے ہیر بھی اس سے کم کائیاں نہیں ہے۔ جب وہ دلہن بن کر رنگ پور گئی تو ایک رات سیدا کھیڑا اس سے وصل کا طالب ہوا۔ ہیر نے نماز پڑھنے کا عذر کیا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ آخر ہیر نے پنج پیروں کو پکارا۔ وہ آئے اور سیدے کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ سیدا بڈھا کھوسٹ تھا جبکہ ہیر ہٹی کٹی جوان عورت تھی۔ اس نے خود سیدے کو پھینٹیاں دیں اور نام پنج پیروں کا کر دیا تاکہ وہ آئندہ اس قسم کی جسارت نہ کرے۔ پنج پیروں کے علاوہ اور بھی کئی مافوق الطبع عناصر ہیں۔ مثلاً شیر رانجھے سے باتیں کرتا ہے۔ رانجھا سہتی کے پیالے میں دودھ چاول دکھا دیتا ہے۔ رانجھا دُعا مانگ کر مراد بلوچ کو حاضر کر دیتا ہے اور بددعا سے

راجہ عدلی کے شہر کو آگ لگا دیتا ہے۔ دیہاتی پیروں کی کرامات پر محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ آج بھی پیرزادے اپنی کرامات کے افسانے سُنا سُنا کر اُنھیں فریب دیتے رہتے ہیں۔

وارث شاہ کا ادّعا یہ ہے کہ ہیر رانجھے کے قصّے کے پیرائے میں اُنھوں نے تصوّف و عرفان کے مضامین پیش کیے ہیں۔ ؎

تخم رمز دا بیجیا اساں لوکو سارا رمز دا باغ لگایا ئی
ناہیں جاہلاں نال کچھ غرض ساڈی عقلمنداں نوں سخن سمجھایا ئی
عاقل رڑک کے دُودھ کڈھ لین مکھن چھاہ جاہلاں پھوک پلایا ئی
پا لین عاقل اصل رمز تائیں جاہل آکھ دے مغز کھپایا ئی

وہ اپنی رمزیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہیر روح ہے۔ چاک قلبوت ہے بالناتھ مرشد ہے۔ پانچ پیر حواسِ خمسہ ہیں۔ مسجد ماں کا پیٹ ہے۔ ملکی اور چوچک اُصولِ فقہ ہیں ؎

ہیر روح تے چاک قلبوت جانوں بالناتھ ایہہ پیر بنایا ئی
پنج پیر نے پنج حواس تیرے جنھاں راہ تے نذھ نوں لایا ئی
اوہ سیعیت ہے ماں دا شکم بندے جدے وچ دن رات لنگھایا ئی
ملکی چوچک نے فقہ اصول دونویں جنھاں حق دا راہ بتایا ئی

اسی طرح کیدو شیطان ہے، ناگ حرص ہے، میکہ دنیا ہے، باغ گور ہے، شیر نفس اہنکار ہے، بھابی شہوت ہے، رابیل باندی بھوک ہے، ترنجن اعمال بد ہیں، سہتی موت ہے۔ قاضی حق ہے۔ بیڑی پلنگ والی پُل صراط ہے۔ کھیڑا عزرائیل ہے۔ نائیوں کا گھر پوشیدہ گناہ کرنے کا مقام ہے، وٹھلی ناطقہ ہے۔ سہیلیاں گھر گرہست ہیں۔

وارث شاہ کے اس ادّعا کے باوصف "ہیر" کو ایک رمزیاتی قصّہ نہیں سمجھا جا سکتا جیسا کہ جان بنین کا "پلگرمز پروگرس" ہے۔ وارث شاہ عشقِ مجازی کی ترجمانی میں ایسے مُنہمک

ہونے کے بعد نظم کرتے وقت عشقِ حقیقی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور شیخ سعدی اور حافظ شیرازی کی طرح وہ بھی عشقِ مجازی میں کھو کر رہ گئے۔ وارث شاہ کے یہاں بھی ان شعرا، کی طرح کہیں کہیں عشقِ حقیقی کی جھلکیاں دکھائی دے جاتی ہیں لیکن من حیث المجموع کلام پر عشقِ مجازی ہی کا غلبہ ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وارث شاہ پہلے شاعر اور فن کار ہیں اور بعد میں صوفی ہیں۔ کونٹ لیو ٹالسٹائی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مذہب اور اخلاق اس کے ذہن پر پوری طرح مسلط ہو گئے اور وہ ادب و فن کو مذہب و اخلاق کے مقابلے میں حقیر و صغیر سمجھنے لگا۔ اسی دور میں اس نے ایک طویل مختصر افسانہ لکھا "کرائٹزر سوناٹا"[1]۔ اسے لکھتے وقت فن کار کی محویت اور از خود رفتگی نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور وہ مذہبی و اخلاقی نظریات یکسر بھول گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ افسانہ چھپا تو مخربِ اخلاق سمجھ کر اسے ممنوع الاشاعت قرار دیا گیا۔ وارث شاہ بھی صوفی ہونے کے باوجود "ہیر" لکھتے وقت ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ تصوف اور رمزیت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ چنانچہ "ہیر" عطار یا سنائی کی مثنویوں کی طرح ایک رمزیاتی اور متصوفانہ قصہ بن کر نہیں رہ گئی بلکہ فنِ لطیف کے ایک درخشاں شہ پارے کی شکل اختیار کر گئی۔

ہمیں وارث شاہ کی اس رمزیاتی تشریح سے بھی اتفاق نہیں ہے جو انھوں نے قصے کے اواخر میں کی ہے۔ وہ ہیر کو روح اور رانجھے کو قالب کہتے ہیں۔ ہیر کو روح اور رانجھے کو محبوبِ ازلی کے رابطے سے تو سمجھا جا سکتا ہے لیکن انھیں روح اور قالب کے تعلق سے سمجھنا باعثِ تردد ہے۔ نوفلاطونیت، وحدت وجود اور ویدانت تینوں کی رو سے روح مادی جسم کی قید میں اسیر ہو جاتی ہے جس سے گلو خلاصی پانے کے لئے تجرد اور مراقبے کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہیر کو روح اور رانجھے کو قالب سمجھ لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ روح قالب سے واصل ہونے کے لئے بے چین ہے جو ظاہراً ناقابلِ قبول ہے۔ اسی طرح بالناتھ کو مرشد سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ بالناتھ رانجھے کا گورو ہے لیکن

1ـ Kreutzer Sonata

رانجھا اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے بجائے صریحاً ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وارث شاہ پانچ حواس کو پنج پیر قرار دیتے ہیں جو ان کے بقول انسان کو راہِ راست پر لاتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب تک حواس مُدرکہ (اندریوں) پر پوری طرح قابو نہ پا لیا جائے، جوگ یا عرفان مکمل نہیں ہو سکتا۔ جوگ یا وحدت وُجوُد دونوں میں حواسِ مُدرکہ سالک کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ چُوچک اور ملکی اصولِ فقہ ہیں جو حق کی راہ دکھاتے ہیں اور قاضی حق کی علامت ہے۔ قِصّے میں لکھتے ہیں کہ چُوچک نے رانجھے کو فریب دیا تھا اور قاضی نے اس کے ساتھ سازش کر کے بغیر ایجاب و قبول ہیر کا نکاح سیدے سے کر دیا تھا۔ اس صورت میں چُوچک اور ملکی کو اصولِ فقہ اور قاضی کو حق کی رمزیاتی علامتیں کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کیدو ان معنوں میں بے شک شیطان ہے کہ وہ ہیر رانجھے کو بہشت کے جنّتِ عدن سے نکلوانے کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن وہ ابلیس کی طرح گمراہ کرنے والا شیطان نہیں ہے۔ وہ ہیر کو گناہ کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ ہیر اور رانجھے کے تعلق کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے۔ حرص کو کھینچ تان کر ناگ، ناؤ کو پُلِ صراط، میلے کو دنیا، باغ کو گور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سہتی جیسی شوخ و شریر لڑکی کو موت کہنا اور سیدے جیسے بودے بُزدل کو عزرائیل کہنا کسی صورت بھی موزوں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قِصّہ مکمل کرنے کے بعد اہلِ ظاہر کی تعریض و تنقید سے بچنے کے لئے وارث شاہ نے اسے رمزیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح وہ اہلِ ظاہر کی تعدّی سے تو محفوظ ہو گئے لیکن اپنے فن پر تصوّف و رمزیت کا پردہ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ ایک صُوفی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ شاعر کی حیثیت سے ان کے یہاں تصوّف کا کوئی مقام ہے تو وہ یہی ہے کہ بقول علی حزیں:

"تصوّف برائے شعر گفتن خوب است"

جس طرح "دیوانِ حافظ" کی رمزیاتی ترجمانی میں شارحین نے مضحکہ خیز تاویلیں کی ہیں اسی

طرح وارث شاہ کے بعض شارحین نے بھی عجیب وغریب نکتے پیدا کئے ہیں مثلاً وارث شاہ کہتے ہیں۔

رانجھا آکھدا بھابیو وَیریوں نی مینوں بھابیاں تھیں چا وچھوڑیا جے
سکیاں بھائیاں تھیں نکھیڑ وچھوڑ مینوں کنڈا وِچ کلیجڑے پوڑیا جے

ہاشم علی اس کی شرح یوں کرتے ہیں کہ اس سے مُراد حضرت آدم کا اشیاء سے ہمکلام ہونا ہے۔

شعر ہے   منہ چنڈ جو آرسی نال دیکھیں تیہاں ڈھنگ کیہا ہل واہنا ئی
پنڈا پال کے چوپڑے پٹے جنہاں کسے رتی کی اوسنوں چا ہنائی

یہی شارح فرماتے ہیں کہ اس سے مُراد فرشتوں کا خدا کو یہ کہنا ہے کہ آدم زمین پر اچھے کام نہیں کرے گا۔

شعر ہے   حضرت قاضی نے بیچ سدوا سارے بھایاں زمین نوں کچھ ہو ایائی
دوڈھی دے کے زمیں دے بنے وارث بنجر زمیں رنجھیٹے نوں آیائی

ایک شارح کہتا ہے کہ خدا نے فرشتوں کو اپنے اپنے کام پر معین کیا۔ جبریل کو وحی، میکائیل کو رزق، عزرائیل کو قبضِ ارواح اور اسرائیل کو صُور پھونکنے کے فرائض تفویض ہوئے۔ یا مظہر العجائب!

مقام شکر ہے کہ اس نوع کی تاویل وتشریح خواص تک محدود رہی" خواص" شروع سے قدما رکے سادہ متن پر بعید از فہم حاشیے چڑھاتے رہے ہیں۔ عوام نے قصّے کی اصل رُوح کو سمجھا اور اس سے انسان دوستی، خلوص ومحبت، ایثارِ نفس اور خود فراموشی کے سبق سیکھے۔" خواص" نے وارث شاہ کو محض ایک صُوفی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ عوام نے ہمیشہ اسے اپنا شاعر جانا اور اس کے پڑھنے اور سُننے سے حظ ومسرّت کی دولت سمیٹتے رہے۔ اسی عوامی جذب وکشش نے" ہیر وارث شاہ" کو بقائے دوام عطا کی ہے۔

دیس پنجاب کی تصویر کشی

ہیر وارث شاہ دیس پنجاب کا ایک دلکش مرقّع ہے جس کے صفحات میں پنجاب کے دیہات کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے بیلے موجیں مار کر بہتے ہوئے دریا، لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت، رہٹ کی روں روں، ہل چلاتے ہوئے، ڈھور چراتے ہوئے، فصل کاٹتے ہوئے، دائرے میں بیٹھ کر حقّے کے کش لگاتے ہوئے، ڈھول کی ہیجان آور تال پر مستانہ وار بھنگڑا ناچتے ہوئے، جوڑی کی ولولہ انگیز تانوں پر ڈھولے گاتے ہوئے کڑیل جاٹ۔ کنوئیں پر پانی بھرتی ہوئی، چکّی پیستی ہوئی، دودھ بلوتی ہوئی، اُپلے تھاپتی ہوئی عورتیں۔ چیختے چلاتے کلکاریاں مارتے ہوئے بچّے۔ پھڑ مٹّو مار کر پھمنیاں ڈالتی ہوئی اور چاندنی رات میں ککلی ناچتی ہوئی جوان لڑکیاں۔ ترنجن کے چرخوں کی گھوں گھوں میں کنواریوں کے دبے دبے قہقہے۔ جھگڑالو عورتوں کے چبھتے ہوئے طعنے مہنے۔ شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں کے ہنگامے۔ بپھرے ہوئے جاٹوں کی گرجدار بڑھکیں کانوں میں سونے کے بُندے چمکاتے سروں پر چیرے باندھ کر گلیوں میں اینڈتے ہوئے چھیل چھبیلے گبھرو۔ مکھن اور ملائی کھا کھا کر پلی ہوئی موٹی تازی جھٹیاں۔ بھنگ پی کر ہنکارنے والے ملنگ۔ دائروں میں جھگڑے فیصل کرتے ہوئے سنجیدہ عمر رسیدہ جاٹ اور ان جیسی بے شمار دلآویز

تصویریں ہیر وارث شاہ کے اوراق میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ ہیر کی تصنیف پر کم وبیش دو صدیاں گذر چکی ہیں لیکن جدید تہذیب کے شیوع کے باوجود ہمارے یہاں کے دُور اُفتادہ دیہات میں وہی زرعی معاشرہ قائم ہے جس کے شاعر وارث شاہ تھے۔ شہروں اور ان کے نواحی قصبات میں زندگی کی رفتار موٹر کار، ریل اور ہوائی جہاز سے ناپی جاتی ہے دیہات میں زندگی اپنی اسی ڈگر پر اونگھ رہی ہے۔ جدید دور نے ان تصویروں کے خطوط بے شک دھندلا دیئے ہیں لیکن تصویروں کے خدّوخال بڑی حد تک بحال و برقرار ہیں۔

طوالت کے خوف سے اس مُرقعے کی چند تصویریں ہی دکھائی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ دیہات میں صبح کیسے طلوع ہوتی ہے وارث شاہ کہتے ہیں کہ چڑیوں کی چوں چوں اور لالیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ ہی راہی اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ چندر بنسی خاندان کی بادشاہی ختم ہوئی اور سورج بنسیوں کا راج آ گیا۔ (چاند غروب سورج طلوع ہوا) سیاہ فام ہندو راجاؤں نے شکست کھائی اور حکومت کی باگ ڈور گورے چٹّے درّانی افغانوں کے ہاتھ میں آ گئی (رات گئی، دن آیا) لوگ جاگ جاگے اور اپنے اپنے کاموں میں جُٹ گئے۔ عورتوں نے چرخہ کاتنا شروع کیا۔ کچھ عورتوں نے مٹکیاں دھو کر صاف کیں اور دُودھ بلونا شروع کیا۔ عورتیں جنھیں روٹی پکانے کا تردّد کرنا تھا چکی پیسنے لگیں۔ جن لوگوں نے رات کو سیج کے مزے لُوٹے تھے غسل جنابت کے لئے بھاگ نکلے ہل چلانے والے بیلوں کو جوتنے لگے۔ کمیّوں نے رہٹ چلائے اور گاہدی پر بیٹھ کر حقہ لینے لگے۔ کمہار مٹی ڈھونے کے لئے اپنے گدھوں پر پالان کسنے لگے۔ اور جولاہوں نے اپنی تانیاں بھگونی شروع کر دیں۔ زاہدوں نے وضو کیا اور تسبیح سنبھالی۔ ملّا نے اذان دی۔ کارواں سرائے سے قافلہ روانہ ہوا اور گھنٹیوں کی آواز آنے لگی۔ حفّاظ نے

ے یہ سطور حالیہ انتخابات سے بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ سیاسی بیداری جنگل کی آگ کے مانند ہر کہیں پھیل گئی ہے۔

قرآن کی تلاوت شروع اور سالکین عشق کی منازل طے کرنے کے لیے مُراقبے میں غرق ہو گئے۔

چِڑی چوہکدی نال جاں ٹُرے پاندھی پیاں دُدھ دے وِچ مدھانیاں نے
ہوئی صبح صادق جدوں آن روشن تدوں لا لیاں آن چکلانیاں نے
چندر بنسیاں دی شاہی ختم ہوئی سورج بنسی کر دے حکمرانیاں نے
سیاہ فام تھاراجیاں ہندیاں تھیں لیا راج افغاں دُرانیاں نے
کاروبار دے وِچ جہان ہویا چرخے ڈاہندیاں اُٹھ سوانیاں نے
اکناں اُٹھ کے ریڑکا پا دِتا اک دھوندیاں پھرن دوہانیاں نے
گھربار نال چکّیاں جھوتیاں نے جنہاں تاؤناں گُتھ پکانیاں نے
سویرے غسل دے واسطے جان دوڑے سیجاں جنہاں نے رات نوں مانیاں نے
اک اُٹھ کے ہلیں تیار ہوئے اک ڈھونڈدے پھرن پورانیاں نے
لیاں کڈھ پرانیاں ڈالیاں نے سیّں بھوئیں نوں جنہاں نے لانیاں نے
پاتی لال نوں کامیاں کھوہ جُتّے بیٹھے گاہدی تے لین جھولانیاں نے
مٹّی لین نوں گدھے گھمیار کِتے چلّے پادلی کرن بیپانیاں نے
وضو ساز کے زاہداں پھڑی تسبیح بانگاں مسجدیں کِیاں مُلوانیاں نے
ہوئے قافلے کُوچ سرائے وِچوں کھڑکے ٹل پربھات چلانیاں نے
شروع حافظاں دَور قرآن کیتا جنہاں منزلاں ست مُکانیاں نے
مسلک عشق دے ہوئے روان سالک جنہاں کرنیاں ہفت طیرانیاں نے

آج بھی پنجاب کے دور افتادہ دیہات میں صبح اسی طرح طلوع ہوتی ہے۔ دیہاتی دن بھر کی محنت مشقت سے چور سرِ شام گہری نیند سو جاتے ہیں اور صبح سویرے جاگ کر پھر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ وارث شاہ کی قوتِ مشاہدہ وصف نگاری میں پوری طرح نکھرتی ہے۔ وہ جزئیات کا احاطہ فن کارانہ چابکدستی سے کرتے ہیں۔ بارات کی آمد

اور متعلقہ رسوم کا ذکر ان کی وصف نگاری کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ بارات کے ساتھ ڈوم گاتے ہوئے آرہے ہیں۔ شہنائیاں بج رہی ہیں۔ بھانڈ نقلیں کر رہے ہیں۔ رنڈیاں بھاؤ بتا بتا کر سُریلی تانیں اُڑا رہی ہیں اور مور کی طرح اٹھلا اٹھلا کر قدم اٹھاتی ہیں۔ گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ زمین کی مٹی اڑ کر چاروں طرف غبار پھیل گیا ہے۔ گھوڑے مختلف رنگوں کے ہیں مشکی، چینے، کمیت، عراق، سبزے، چپینے، نقرے، تیلے، کلّے، سمند، سب کونتیاں اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ ان کے ساز پھندنوں سے سجائے گئے ہیں۔ باراتی سرخ بانات کی زینوں پر سوار بیٹھے ہیں۔ شراب پی رکھی ہے۔ ہاتھوں میں نیزے تھام رکھے ہیں۔ کیسری رنگ کے طُرّے اور چیرے لہرا رہے ہیں جن سے پھول لٹک رہے ہیں۔ ٹکے لُٹاتے آرہے ہیں۔ باراتیوں نے سنہری اور بلوری پیالوں میں بھنگ پی ہے۔ میراثنیں ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سہرے گانے کے گیت گا رہی ہیں۔ میراثی سریلی آواز میں کبت پڑھ رہے ہیں۔ بارات رنگ پور سے آئی اور سیالوں کے ہاں ٹھہری۔ کمین اپنے اپنے لاگ نیگ لینے کے لئے آئے۔ کھیڑوں کے گھوڑوں کی لگامیں تھام انھیں نیچے اُتارا اور خوشامدانہ لہجے میں لاگ مانگنے لگے۔ دائرے میں شطرنجیوں پر باراتی صف بہ صف بیٹھ گئے۔ سب کو شربت پلایا گیا۔ سہرے، دُودھ پیلے اور چھوڑے تحفے حاضر کئے گئے۔ پچواں حقوں کے نیچے نیچے نلّے سے منڈھے ہوئے تھے۔ ڈوم ڈھاڑی کھڑے دعائیں دینے لگے اور کھیڑے فیاضی سے بخشش کرنے لگے ؎

ڈھاڈی کنجریاں بھگتے نقلئے سن نالے ڈوم مرود خود گائے کے جی
کشمیر دے وکھنی نال واجے ترہیاں تُونتیاں چھتّا چھنکائے کے جی
بیا آن جنکار سے گھوڑیاں دا اُڈّی ذھرت دی وسوڑ دھمکائیکے جی
نیلے شربتی تنج کلیان کلّے چھتے نُقراں نال سجائے کے جی
مُشکی چینے، کمیت، عراقیے سن برسے جنیاں رنگ لہرا ئیکے جی
نُقرے نیلے، کلّے، سمند چوہے جلن چال کنوتیاں چائے کے جی

کھیڑے جوئے اسوار نے گھوڑیاں تے زینیاں سرخ بنات دیاں پائیکے جی

دارو نوش کرکے مے کے ہتھ نیزے چڑھے گھیر دھرگ وجائیکے جی

کیسر بھنبڑے لگاں دے پیچ آہے چڑھے سورمے جنج بنائے کے جی

پھل سہریاں لڑیاں نال لٹکن سکے دِتے تے لکھ لٹائے کے جی

سونے رپے بلور دے جام آہے پوست پیندے بھنگ چھنائیکے جی

سہرا گھوڑیاں راگ میراساں دا گاون ڈھولکاں نال سمجھائیکے جی

گاون کنجریاں خوب آواز کرکے اُتے دسدیاں دست بتائے کے جی

وانگ مور دے پائلیاں پاندیاں نے ناچ نچدیاں پیر اُٹھائے کے جی

مردار کبت سن بہت پڑھدے دیندے نوک زبان سنائے کے جی

گیتا جنج اُتارا آ چوک اندر صفاں بوریئے دیبنھ بچھائے کے جی

مجلس لا بیٹھے وچ دائرے دے شربت پیندے صاف کرائیکے جی

سونے رپے تے چم دے لیا حقے بجلی بھرت دے چمک چمکائے کے جی

پیچوان چکانے خوب نیچے سچے تلے دے بند پوائے کے جی

وارث شاہ دے تان کے تنگ مرتے سہرے گھنے دے سبھ بنھائیکے جی

چڑھی رنگ پور نقیں جنج کھیڑیاں دی ڈھکی شہر سیالاں دے آئیاں

لاگی لکھ خوشادی ہوئے حاضر گھوڑے کھیڑیاں دِتے پکڑائیاں

شطرنجیاں گھت وچ ستھ بیٹھے ڈھاڈی کرن سلام دعائیاں

وارث شاہ اگے ڈھاڈی گاوندے نے کیتی کھیڑیاں بہت عطائیاں

شادی پر شراب پینے کی روایت پنجاب کے دیہات میں قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ آجکل یہ صرف بعض وسطی اضلاع تک محدود ہے۔ فلموں کی مقبولیت نے رنڈیوں کے مجرے ختم کر دیئے ہیں لیکن باراتیوں کی تفریح کے لئے بھانڈ لیتڑے لئے آج بھی موجود ہوتے ہیں۔

اور ڈوم ڈھاڑی شجرے سنا سنا کر انعام پاتے ہیں۔ دیہات میں باراتیوں کو حملہ آور سمجھ کر ان کی مزاحمت کی جاتی ہے۔ جوان عورتیں مکانوں کی منڈیروں پر پرے جا کر بیٹھ جاتی ہیں اور باراتیوں کو وہ بے نقط سناتی ہیں کہ شیطان سن پائے تو اس کا رنگ بھی فق ہو جائے۔ دولہا کی ماں بہن بیجی، ممانی کا نام لے لے گالیاں دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات باراتیوں پر اُپلے اور مٹی کے ڈھیلے بھی پھینکے جاتے ہیں۔ وارث شاہ کہتے ہیں ؎

دیکھو جھنگ سیال بہشت بنیا کڑیاں میل دیاں خوب سہایائی
سرتے چھتیاں سوہنیاں گُندکے تے اکو جیہڈیاں متا پکایائی

اس کے بعد لڑکیوں نے دولہا، شہ بالے اور باراتیوں پر گالیوں کی جو بوچھاڑ کی ہے وہ وارث شاہ کی حقیقت نگاری پر دلالت کرتی ہے۔ بارات کی آمد پر سمدھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں ؎

جانجی کس کمراں سبھے کھڑے ہوئے تدوں تلیاں آن مشال پھڑی آ
سیال شکر گذارڈے رب اگے جدوں جنج دروازیوں آن وڑی آ

بارات غروب آفتاب کے بعد جب تارے چھٹک گئے ہوں دلہن کے گھر میں داخل ہوتی ہے اس لئے مشعلیں روشن کی جاتی ہیں اور یہ کام تیلیوں کے سپرد ہوتا ہے۔ نائی بتاشے لاکر آگے رکھتا ہے ؎

نائی ملک کے تھال بتاسیاں دا دھریا کھیریاں دے اگے آ سیاں
پنج روک روپے تے اک ٹنگی دھریا کھیڑیاں دا سرد پا میاں

یہ رسمیں بڑے بڑے قصبوں میں ختم ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ مکین جوق در جوق شہروں کا رُخ کر رہے ہیں۔ لیکن دور افتادہ دیہات میں باقی و برقرار ہیں۔

یہ تو بارات کی ایک جھلک تھی۔ بارات کی آمد کے دن دُلہن کی عزیز رشتہ دار عورتیں بناؤ سنگار کرکے دُلہن کے گھر آتی ہیں۔ اس اجتماع کو میل کہا جاتا ہے اور عورتوں کی زیبائش

آرائش کو "میل پھین" کا نام دیتے ہیں۔ وارث شاہ نے میل کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے
پریوں کی طرح خوبصورت جٹیوں کے قاتل نین شاہ پری کے حسن کو بھی مات کر رہے
ہیں۔ وہ ناز سے قدم اٹھاتی ہیں۔ لگتا ہے جیسے پریوں کی طرح پرواز کرنے والی ہیں۔ کچھ ایک
دوسری کو گلے لگائے کھڑی ہیں۔ اور کچھ باراتیوں کو طعنے اور گالیاں دے رہی ہیں۔ کچھ سہرے
کے گیت گا رہی ہیں۔ وہ اپنے حسن کا عکس آرسی میں دیکھتی ہیں تو ان کے چاہنے والے دیدار
کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔ جو عورتیں سٹیڑوں پر بیٹھی ہیں وہ چادر ہٹا ہٹا کر ابھری ہوئی
چھاتیوں کی بہار دکھا کر نیچے جھانک رہی ہیں۔ کچھ تالیاں پیٹ پیٹ کر ناچ رہی ہیں اور کچھ
کوئل اور کونج کی طرح سریلی دردناک آواز میں دوہڑے گا رہی ہیں۔ جھنگ سیال کی لڑکیاں
میل کی پھین کر کے سہاگ کے گیت گا رہی ہیں۔ شادی شدہ عورتوں کے زرنگار جوڑے دیکھ
دیکھ کر کنواریاں شرمائی جا رہی ہیں۔ جھنگ کی گلیوں میں ہر کہیں میل کی رونق ہے لڑکیاں ناز و
ادا سے گھوم پھر رہی ہیں۔ میراثنیں ڈھولک بجا رہی ہیں اور ساتھ ہی اٹھلا اٹھلا کر قدم اٹھا
رہی ہیں۔ عورتوں نے اپنے آپ کو عطر میں بسا رکھا ہے۔ ابٹن سے ان کا رنگ نکھر گیا ہے۔
کچھ عورتوں نے جوگی جوگن کا سوانگ بنا رکھا ہے۔ ان کی پیچ در پیچ زلفیں ہوا میں لہرا رہی
ہیں۔ ہونٹوں پر مسّی کی لالی جما رکھی ہے۔ پہلے آرسی میں اپنا چہرہ دیکھتی ہیں اور پھر چاہنے
والوں کو مکھڑا دکھاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں تالیاں پیٹ پیٹ کر پھینیاں ڈال رہی ہیں۔ کچھ آرسی
میں کچھ جا رہی ہیں۔ ہیر کی سہیلیاں ایک سے ایک خوبصورت کچھ پتلیوں کی طرح نازک اندام
دھان پان اور کچھ گداز بدن کی گدبدی ہیں۔ وہ نہایت نزاکت سے ہاتھ میں ہاتھ ملائے مست
خرامی کر رہی ہیں چہرے پر سیاہ زلفیں ایسی ناگنوں کی طرح ہیں جنھیں منتروں سے مسخر کر لیا
گیا ہو۔ آنکھوں میں کجلے کی دھاریاں تیغ دھاری فوج کی طرح قتل عام کر رہی ہیں۔ بے طرحدار لڑکیاں
چاروں طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی جا رہی ہیں۔

پریزاد جٹیاں نین خونی شاہ پری دی ہوش و تجاندیاں نے

جا پن اُڈ دیاں جاندیاں حسن بھریاں ایسا ناز بھتیں قدم اُٹھاندیاں نے
اک بھٹنیاں دین تے لین گالیں اک سہرے دا گیت سناندیاں نے
اک ہو اکٹھیاں نال نخرے نال ہیک دے ہیک ملاندیاں نے
نال آرسی مکھڑا ویکھ سندر پیاں عاشقاں کوں ترساندیاں نے
اک لاہکے چادراں کڈھ چھاتی اوپر واڑیوں چھاتیاں پاندیاں نے
اک وانگ بساتیاں کڈھ لاٹو ویرا راہ دی نات دکھاوندیاں نے
اک تاوڑی مار کے نچدیاں تے اک سُوہ نوں پیاں اکاندیاں نے
اک گاؤں کے کوٹلاں کوں رنج ہویاں وہڑے راہ وچ اک الاندیاں نے
اک آکھدی مور نہ مار میرا اک وچ ممولڑا گاندیاں نے
کڑیاں جھنگ سیالناں میل سُہایاں انداز تے ناز بناندیاں نے
مطرب زادیاں ڈھول وجائیکے تے نال چاوڑاں قدم اٹھاندیاں نے
اک عطر عبیر پھلیل لاون وٹنا انگ تے انگ ملاوندیاں نے
اک سوانگ بن کے جوگن جوگیاں دا انگ سواہ بھبوت رماندیاں نے
دل پائیکے خوبیاں پٹیاں نوں سُک چپ کے لیاں رنگاندیاں نے
نال آرسی مکھڑا ویکھ پہلے فیر عاشقاں دید کراندیاں نے
بھڑتھو مار کے بیٹھیاں گھنڈیاں نے اک آندیاں دُوجیاں جاندیاں نے
وارث شاہ دا چور ماگٹ کے تے پڑھ فاتحہ ونڈ ونڈاندیاں نے

سنگ سٹھ سہیلیاں سب سارا اک دُوجی توں رنگ رنگیلیاں نے
اک بھاریاں گوریاں حسن اندر اک نازکی نال پتیلیاں نے
کنگی پائیکے لشکدی چال چلن نال چاوڑاں چھیل چھبیلیاں نے
زُلفاں کالیاں ناگناں لکھڑے تے کسی باندی منتراں کیلیاں نے

سُرمہ کجلا کنگ قندھار دائی گولی نظر دی تاڑ دی جلیاں نے
السیں بجر چناب دسے ناز نیارے ناز بھنیاں سچ سجیلیاں نے

کنواری اور شادی شدہ عورتیں شادی کے گھر سولہ سنگار کر کے آتی ہیں۔ آج ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ چلنے پھرنے، ہنسنے کھیلنے، ناچنے گانے کی پوری آزادی ہے۔ چاروں طرف چاہنے والوں کا جھرمٹ ہوتا ہے جوشِ آرزو سے لرزتی ہوئی نگاہیں ٹکراتی ہیں اور شوقِ ملاقات سینوں میں جوش مارتا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں۔ ناز و ادا کے کرشمے دیکھنے والوں کو گھائل کرتے ہیں۔ پیار بھرے گیت گائے جاتے ہیں۔ گانے، ناچ اور ڈھولک کی تھاپ پر نگاہیں آوارہ ہو جاتی ہیں اور رگ و پے میں شعلے دہکنے لگتے ہیں۔ وارث شاہ کی نفسیاتی بصیرت قابلِ داد ہے کیا خوب کہا ہے کہ کنواریاں شادی شدہ عورتوں کے زرنگار لباس دیکھ دیکھ کر شرائی جا رہی ہیں۔ اور حسین عورتیں سنگار کر کے پہلے آرسی میں اپنا چہرہ دیکھتی ہیں اور پھر اپنے عشاق کو مکھڑا دکھاتی ہیں۔

شادی کی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے وارث شاہ کہتے ہیں ہیر کو کئی دنوں سے مائیں بٹھا رکھا تھا۔ اسے گھڑولی کے پانی سے غسل دیا گیا۔ گھڑولی بھرنا ہمارے دیہات کی ایک دلچسپ رسم ہے۔ جوان لڑکیاں گھڑے پر لال رنگ کی صافی لپیٹ کر گانے گاتی ہوئی گاؤں کے باہر جاتی ہیں اور کسی کنوئیں سے گھڑا بھر کر لاتی ہیں جس سے دلہن کو نہلایا جاتا ہے۔ عورتوں کے جھرمٹ کے ساتھ ایک خاص تال میں ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔ ماہیئے کا بول ہے :

دو پتر ہر تولی دے
کھل گئی مینڈھی وج گئے ڈھول گھڑولی دے

یعنی دلہن کے کنوارپنے کی مینڈھیاں کھول دی گئی ہیں اور اسے نہلانے کے لئے گھڑولی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

پنڈ دادنخاں میں شادی کے موقع پر لڑکیاں ماہیئے کے یہ بول گاتی ہیں :

کچے دی ونگ ماہیا ہے
اوہ کی کرسن بھنے جنہاں دے سنگ ماہیا

لڑکیوں کی دوسری ٹولی جواب دیتی ہے : کچے دی ونگ ماہیا
اوہ پئے رو سن بھنے جنہاں دے سنگ ماہیا

نکاح کے بعد دولھا کو سسرال کی عورتیں گھر کے اندر بلاتی ہیں۔ یہ وقت اُس بیچارے پر بڑا نازک ہوتا ہے اور اس کی جو گت بنائی جاتی ہے وہ ساری عمر نہیں بھولتا۔ طرح طرح کی شرارتوں اور چھیتوں سے سالیاں اس کا ناک میں دم کر دیتی ہیں۔ سالیوں کے مذاق بعض اوقات خاصے خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ وارث شاہ کہتے ہیں کہ اس موقع پر سالیوں نے سیدے کھیڑے کو مُوں سے ناپا پھر اس کی چھنگلی سے چھنا کھلوایا گیا۔ اسے اور شہ بالے کو نکو بنایا گیا۔ اسے چھیتیاں دی گئیں۔ سیدے کو اُلٹی شلوار میں سے نکالا گیا۔ اور عجیب و غریب فرمائشیں کی گئیں۔

دُلہن کو پالکی میں بٹھایا جائے تو وہ ڈھاڑیں مار مار کر روتی ہے اور میراثنیں لمک لمک کر بابل کا گیت گانا شروع کر دیتی ہیں جس سے مرد عورتوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ جب ہیر کو پکڑ دھکڑ کر پالکی میں بٹھایا گیا تو اس نے رو کر کہا ے

ڈولی چڑھدیاں ہیر ورلاپ کیتا مینوں لے چلّے بابلا لے چلے وے
مینوں رکھ لے بابلا گھت ڈولی کہار چک کے پیے در پیئے چلے وے
میرا آکھیا کدی نہ موڑدا سیں او سے بابل کہتے گئے چلے وے
تیرے چھتر چھاویں بابل رُکھ وانگوں اسیں وانگ مسافراں بہہ چلے وے
دِن چار نہ رج آرام کیتا دُکھ درد مصیبتاں سہہ چلے وے
سانوں بولیا چالیا معاف کرنا ہیچ روز تیرے گھر رہ چلے وے

ہیر کی پالکی سسرال پہنچی تو وہاں بھی شگن شگون اور رسمیں ادا کی گئیں۔ قرآن شریف پر پانچ اشرفیاں رکھ کر ہیر کی نقاب کشائی کی گئی۔ اس پر پانی صدقہ کر کے لنڈھایا گیا۔ دہلیز پر تیل چوایا گیا۔ جھیوروں نے پانچ پیسے لے کر پالکی اندر رکھ دی۔ ہیر کے سامنے کھچڑی رکھی گئی اور وہ ایک لقمہ چکھ کر دالان میں داخل ہوئی۔

شادی کا ذکر کرتے ہوئے وارث شاہ نے ملبوسات، زیورات، برتنوں اور مٹھائیوں کی تفصیل دی ہے۔ ان میں سے بعض زیور اور کپڑے متروک ہو چکے ہیں۔

زیورات : جھانجر۔ حمیل۔ بازو بند۔ ہس۔ چوک۔ کنگن۔ لونگیر۔ توڑے۔ پاؤنٹی۔ پینچی۔ حگنی۔ مچھیاں۔ پازیب۔ گھنگھرو۔ جھکے۔ چونپ کلی۔ اسکندری۔ بیر بلیاں۔ چھنکنگن۔ ٹکا۔ چنن ہار۔ لوہلاں

کپڑے : لُنگی۔ لاچہ۔ سلاری۔ چوپ چھاُل۔ بافتی۔ پھلکاریاں۔ چرنیاں۔ چارخانہ۔ تنیو۔ خاصہ، گلبدن۔ اطلس۔ کمخواب۔

برتن : چھنے۔ پتیلے۔ گڑوے۔ پراتاں۔ رکاب۔ بیلوے۔ خوانچے۔ طاس۔ تھال۔ کڑچھ۔ کڑاہی۔

مٹھائیاں : شکر پارے۔ نگدی۔ جلیب۔ لڈو بوندی۔ گھانے۔ خطائی۔ بالوشاہی۔ مٹھے کھجور۔ اندرسہ۔ سموسہ۔ کچوری۔ لچی۔ گول گپا۔ بیدانہ۔ گلاب جامن

ہیر وارث شاہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے دو سو سال پہلے عورتوں کی طرح مرد بھی زیور پہنتے تھے۔ راقم نے اپنے لڑکپن میں ایک مسلمان راجپوت کو ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ سکھ سردار اور پہلوان بھی گلے میں سونے کے کنٹھے پہنتے تھے۔ رانجھے نے کانوں میں سونے کے بُندے پہنے تھے۔ جوگ لینے سے پہلے کہتا ہے ؎

پنڈے وال ملایاں دے نال پالے وقت آیا سُو رگڑ مناونے دا
بُندے سونے دے لاہکے جا چڑھیا کن پاڑ کے مُندراں پاونے دا

جاٹوں کی گوتوں اور کمین اقوام کے ناموں سے بھی خاص دیہاتی ماحول قائم ہو گیا ہے۔

جاٹوں کی گوتیں : سندھو۔ باجوے۔ کھرل۔ ترگڑ۔ تارڑ۔ ساہی۔ چیمے۔ چھٹے۔ ڈڈگر۔ ٹوانے۔ دینس۔ وڑائچ۔ چدھڑ۔ باگڑی۔ ورک۔ گوندل۔ چوہان۔ گکھڑ۔ جنجوعہ۔ کھوکھر۔

وارث شاہ نے چوہان۔ گکھڑ۔ جنجوعہ اور کھوکھر بھی جاٹوں میں شمار کئے ہیں۔ حالانکہ یہ راجپوتوں کی گوتیں ہیں۔

کمیوں کے نام : نتھو خوجا۔ کاکا بینجا۔ صدقی پولی۔ لکھمی تیلی۔ فتو کلال۔ جھگڑو ڈوم۔

لکھوں بوچین۔ سمی مالن۔ بختاور لوہاری۔ بخت ترکھانی۔ ستو کمہاری۔ سبھرائی تیلن۔ بھاگو ڈومنی۔ جنگو للارن۔ مٹھی نائن۔

ڈوم کا نام جھگڑو نہایت موزوں ہے۔ ڈوموں کی زبانیں واقعی آندھی کی طرح چلتی ہیں۔ اور یہ کچھ لئے بغیر نہیں ٹلتے۔ شکسپیر نے ایک رنڈی کا نام Tearsheet (چادر چاک) رکھا ہے جو اس کے پیشے کی رعایت سے بڑا مناسب ہے۔[1]

وارث شاہ کی وصف نگاری اور تصویر کشی کی ایک نہایت شگفتہ مثال جوگی کی رنگ پور میں آمد ہے۔ جب رانجھے نے رنگ پور کے باغ میں ڈیرا لگایا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کہتے ہیں کہ کچھ عورتیں اسے دیکھ کر گالیاں دینے لگیں ؎

کائی آکھدی جوگڑا نواں آیا کائی رنّہ دیاں بھواں چڑھاوندی اے
کائی پچھّے دادے سِتاں پھیڑیاں توں غصہ جیو دے وِچ مٹاوندی اے

اکثر عورتیں چھوٹی بڑی کنواری بیاہتا دوڑ دوڑ کر آنے لگیں۔ دانا عورتوں کے ہوش بھی گم ہو گئے۔ بڑی بوڑھیاں لاٹھیاں ٹیکتی ہوئی پہنچ گئیں۔ کچھ عورتیں تازہ دودھ لے آئیں اور کچھ کھیر پکا کر لائیں۔ کچھ عورتوں نے پراٹھے پکائے اور کچھ سردائی گھوٹ لائیں۔ جوگی کے اِرد گِرد لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ نائی اور ڈوم اپنے اپنے دھندے بھول گئے۔ محفلیں اُجڑ گئیں اور لوگوں نے باغ کا رُخ کیا جہاں میلہ لگ گیا۔ شہر سے نانبائی آ گئے۔ قصائیوں نے بکرے ذبح کئے۔ شیر فروش کڑاہیوں میں دودھ ابالنے لگے۔ حلوائی لڈو مٹھیاں حلوہ پوری تلنے لگے۔ عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ نو بیاہتا دلہنوں نے گھروں کے دروازے بند کئے تالے لگائے اور جھانجریں جھنکاتی ہوئی پہنچ گئیں۔ جوگی کے فقر سے مرعوب ہو کر بڑی بوڑھیاں اس کا بدن دابنے لگیں۔ کچھ عورتوں نے میٹھی مٹھیاں اس کے نذر کیں اور سر جھکا کر سلام کیا۔

ایک کہنے لگی: "مجھ نصیبوں جلی کا محبوب روٹھ گیا ہے اور اس کی جدائی میں تڑپ رہی ہوں۔"

دوسری بولی: "پیار نے میرے تن بدن کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔"

---

[1] Henry IV

ایک کہنے لگی : "میرے بانکے نین والے سپاہی محبوب نے مجھے جدائی کی تیغ سے ہلاک کر دیا ہے۔"

دوسری بولی : "جب کبھی میرا محبوب مجھے ملنے آتا ہے میری بھابیاں جل بھن کر کباب ہو جاتی ہیں۔"

ایک کہنے لگی : "میں ہمیشہ لڑکیاں ہی جنتی ہوں اور میری لڑکیوں کے شوہر اُنکی قدر نہیں کرتے۔"

دوسری بولی : "میرے بیٹے ابھی تک کنوارے بیٹھے ہیں ان کی منگنی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔"

ایک کہنے لگی : "میری ساس ہمیشہ مجھ سے خفا رہتی ہے اور مجھ میں کیڑے نکالتی رہتی ہے۔"

دوسری بولی : "میرے دیور ہر روز میرے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔"

ایک کہنے لگی : "مجھے قرض نے بدحال اور بے وقر کر دیا ہے۔"

دوسری بولی : "قرض خواہ نے مقدمہ دائر کر کے میرے مکان قرق کرا لئے ہیں۔"

غرضکہ عورتوں نے اپنی اپنی رام کہانی بے کم و کاست جوگی کو سنائی۔

ایک کہنے لگی : "میں غریب کنگال ہو گئی ہوں۔

دوسری بولی : میرے گھر اولاد نہیں ہوتی، اور سرکار سے جو چھ ماہی مقرر تھی ضبط ہو گئی ہے۔

ایک کہنے لگی : مجھے میرے شوہر نے مار مار کر گھر سے نکال باہر کیا ہے اور وہ مجھ سے ہمیشہ خفا رہتا ہے۔

دوسری بولی : میں اپنے دیوروں، جٹھانیوں اور دیورانیوں کے ہاتھوں سخت تنگ ہوں۔

ایک کہنے لگی : میری ہمسائیاں مجھے ستاتی ہیں اور مجھ پر تہمتیں لگاتی رہتی ہیں۔

دوسری بولی : میرا بیٹا پردیس گیا تھا مدت ہوئی اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

ایک بے جھجک کہنے لگی مجھے کوئی پوشیدہ روگ لگ گیا ہے اور میرے سینے میں عشق کی آگ سلگتی رہتی ہے۔

رانجھے نے نوخیز لڑکیوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور ان سے کہا :

کمہاروں کی آوی میں سے پکائی ہوئی کوری ٹھیکریاں لے آؤ۔

لڑکیوں نے بلا تامل ٹھیکریاں لا کر رانجھے کے آگے ڈھیر کر دیں۔
رانجھے نے کوئلے سے ان پر لکیریں کھینچ کر عورتوں کو دیں۔
کسی سے کہا اسے منہ میں رکھنا کسی سے کہا اسے کمر کے ساتھ باندھ لینا۔
کسی سے کہا پانی کے گھڑے میں رکھنا اور اس کا پانی سارے کنبے کو پلانا۔ سسر، ساس دیور، نندیں، شوہر سب تمہارے مرید ہو جائیں گے۔
کسی سے کہا اسے غلے کی کوٹھی میں رکھنا کسی سے کہا اسے چوکھٹے میں جڑوا لینا۔
کسی سے کہا خاطر جمع رکھو خدا تمہاری مرادیں پوری کرے گا۔
اور اس فقیر کی دعا سے رب بچھڑے ہوؤں کو ملا دے گا۔
کسی سے کہا تیری ساس تجھ سے خفا ہے اس نے تجھے کوئی جڑی بوٹی گھول کر پلا دی ہے۔
سفید مرغے کا خون شیشے میں ڈال کر اس فقیر سے تعویذ لکھوا لینا۔
غرضکہ جوگی نے سب عورتوں کے دل موہ لئے۔
سارے گاؤں میں شور و غوغا مچ گیا اور پرانے جھگڑے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
عورتیں اپنی اپنی غرض کے لئے جوگی کے قریب گھس کر بیٹھ گئیں۔
اور وہ مست بیٹھا باری باری ان کی رام کہانیاں سنتا رہا۔
وارث شاہ کی قدرت بیان، جزئیات نگاری اور نفسیاتی ژرف بینی کسی داد کی محتاج نہیں ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جوگی بھارت چلے گئے ٹلہ جوگیاں اور کٹاس ویران ہو گئے۔ لیکن پیروں فقیروں کے ہاں آج بھی عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے عورتیں ان سے مرادیں مانگتی ہیں اور وہ کاغذ کے پرزوں پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر یا حروف ہندسے لکھ کر ہر عورت سے سوا روپیہ وصول کرتے ہیں۔ ایسے ہٹے کٹے جوان پیرزادوں کی بھی کمی نہیں جو فقیروں کے بھیس میں عورتوں کو ورغلاتے رہتے ہیں۔
ہر ملک و قوم کی شاعری، تمثیلوں اور قصوں میں اپنے اپنے ملک کے نسوانی حسن کے

دلآویز مثالی نمونے ملتے ہیں۔ خوبرو عورت کہیں بھی ہو اس کا حسن دیکھنے والوں کو مسحور کر لیتا ہے۔ لیکن مخصوص آب و ہوا اور طبعی ماحول کے تحت بعض فروعی باتوں میں معیارِ حسن کسی حد تک بدل بھی گیا ہے۔ مثلاً ناروے سویڈن میں سنہرے بال اور نیلگوں آنکھیں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں جبکہ اطالیہ اور ہسپانیہ میں کالی زلفیں اور سیاہ آنکھیں دلوں کو موہ لیتی ہیں۔ عرب سرخ رنگ کی موٹی تازی گول گتھی عورت کو پسند کرتے ہیں۔ ایران میں کشیدہ قامت سیم تن کافر ادا عورت خوش وضع سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں اور جرمنوں کے ہاں نمایاں طور پر بوجھل سُرین اور سینے کا غیر معمولی اُبھار کشش کا باعث ہوتا ہے۔ فرانسیسی نازک کلائی اور ننھے منے گول ٹخنے پر جان چھڑکتے ہیں۔ انگریز عورتیں قدآور اور چوڑی چکلی ہوتی ہیں اس لئے فرانسیسی اُنھیں "گھوڑے" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس انگریز فرانس کی نازک بدن عورتوں کو "کٹھ پتلیوں" کا نام دیتے ہیں۔ چینی عورتوں کو گڑیا (لعبت چین) کہا جاتا ہے۔ چند تصویریں ملاحظہ ہوں :

"تیری رانوں کی گولائی ان زیوروں کی مانند ہے
جنھیں کسی استاد کاریگر نے بنایا ہو۔
تیری ناف گول پیالہ ہے
جس میں ملائی ہوئی مے کی کمی نہیں۔
تیرا پیٹ گیہوں کا انبار ہے۔
جس کے گرداگرد سوسن ہوں۔
تیری گردن ہاتھی دانت کا برج ہے۔
تیری آنکھیں بیت ربیم کے پھاٹک کے پاس حسبون کے چشمے ہیں۔
تیری ناک لبنان کے برج کی مثال ہے۔
جو دمشق کے رُخ بنا ہے . . . .
تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں
تیری سانس کی خوشبو سیب کی سی ہے۔ (غزل الغزلات)

— "لڑکی ایسی تھی جیسے دُنبے کی موٹی تازی چکتی یا صاف چاندی یا سیمیں پر دیبار یا جنگل میں غزال۔ آنکھیں جادو بھری۔ بھویں جیسے کھنچی ہوئی کمانیں۔ رخسار گلابی۔ ہونٹ قند کے۔ سینہ ہاتھی دانت کا۔ رانیں شامی ستونوں کی مانند۔ کولھے ابھرے ہوئے گویا چاندی کی شاخ کے نیچے بلور کے تودے۔ وہ آگے بڑھی تو اس کے کولھے متلاطم سمندر کی طرح لہریں مارنے لگے۔ سینے پر دو انار رکھے ہوئے یا ہاتھی دانت کے دو ڈبے۔ ناف اتنی بڑی کہ آدھی چھٹانک تیل سما جائے۔ پنڈلیاں سنگ مرمر کے ستون۔ سامنے آتی تو فتنہ بپا کرتی اور پیٹھ پھیر کر جاتی تو قتل کر دیتی۔" (الف لیلہ و لیلہ)

— "اس کا نقرہ نقرہ کا مینا ابھری ہوئی چھاتیوں کے بیچ میں لگے ہوئے چندن ہار کے بار بار اُچھلنے سے ظاہر ہے۔" ....

" او کیلے کے ران والی !" (وکرم اروسی۔ کالیداس)

— "بیدوں سے بکھرے ہوئے بیلوں کے اس کنج میں شکنتلا ہو گی کیونکہ اس کے دہانہ پر پھیلی ہوئی ملگجی ریت پر وہ نقش قدم ابھرے ہوئے ہیں۔ جو پنجوں کی طرف پھیلتے ہیں لیکن سرینوں کے بوجھل پن کی وجہ سے ایڑیوں کی طرف گہرے ہیں۔" (شکنتلا۔ کالیداس)

ایران کا حسنِ نسوانی کا تصوّر فارسی اور اُردو غزل میں منعکس ہوا ہے۔

پنجاب میں بہت کچھ نسلی اختلاط ہوا ہے۔ یہاں کے باشندوں میں دراوڑوں، آریاؤں، ہنوں، تاتاریوں، سیتھیوں اور عربوں کے خدوخال باہم گھل مل گئے ہیں۔ پنجاب پر دو سو برس تک ایرانیوں کی حکومت رہی۔ یعنی ہخامنشی خاندان کے داریوش اوّل سے لے کر داریوش سوم تک۔ اس دوران میں ایرانی کشمیر، پنجاب، صوبہ سرحد، افغانستان اور سندھ کے بعض علاقوں میں آکر آباد ہوئے اور یہاں کی آبادی میں خلط ملط ہوئے۔ پنجاب میں پہلوانی کا ادارہ اسی ایرانی تمدن کی باقیات سے ہے۔ قدیم فارسی زبان میں شریف اور خاندانی آدمی کو پہلوا یا پہلوان کہتے تھے۔ اسی طرح دراوڑوں، ہُنوں، سیتھیوں، تاتاریوں اور عربوں کے اثرات بھی باقی ہیں۔ ان اثرات کا

کھوج میلوں ٹھیلوں، زبان کی ساخت، شادی بیاہ کی رسوم اور چہرے کے نقوش میں لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک حسن نسوانی کا تعلق ہے پنجاب کے دیہات میں چمپئی رنگ، سیاہ زلفوں، کشیدہ قامت اور گدرائے ہوئے بدن کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ وارث شاہ نے ہیر کے حسن و جمال کی جو دلکش تصویر کھینچی ہے اسے ہمارے دیہات کے نسوانی حسن کا مثالی نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آج سے دو صدیاں پہلے پنجاب کی دیہاتی عورتیں اپنی زیبائش اور آرائش کا اہتمام کیسے کیا کرتی تھیں۔

• ہیر کی پیشانی چاند کی طرح دمک رہی ہے۔

رنگ شہابی، قاتل زلفیں

آنکھیں نرگسی، رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے۔

بھنویں لاہوری کمان کی طرح کھنچی ہوئی۔

آنکھوں میں سرمے کی دھاریاں جیسے ہند پر پنجابیوں نے حملہ کر دیا ہو

سہیلیوں کے جھرمٹ میں مستانہ وار جا رہی ہے جیسے عقاب ہوا میں جھول رہا ہو

ترنجنوں میں اس طرح مست خرامی کرتی ہے جیسے نواب کا ہاتھی پھر رہا ہو

حسین چہرے پر خال جیسے خوبصورت کتابت کیا ہوا حرف

ہونٹ یاقوت کی طرح سرخ اور لعل کی طرح چمکتے ہوئے

ٹھوڑی ولایتی سیب کی مانند

ناک الف حسینی کی طرح سیدھی

زلف جیسے پہاڑ کے غار سے ناگ نکل آیا ہو۔

دانت چنبیلی کی مانند، حسن کے انار سے نکلے ہوئے موتیوں کے دانے

سرو قد جیتی چین اور کشمیر کی تصویر کی مانند خوبصورت ہے۔

گردن کونج کی، انگلیاں رواں کی پھلیوں کی طرح لمبی، ہاتھ چنار کے پتے کی مانند نرم و نازک

اُبھری ہوئی چھاتیاں جیسے ریشمی گیندیں یا بلخ کے سیب
ناف بہشت کے حوض کی طرح شُشتاب سے بھری۔ پیڑو خالص مخمل کے۔
سُرین کافور کی طرح سفید، پنڈلیاں جیسے منارے ہوں یا ستون
ہونٹوں پر دنداسے کی سُرخی جو دیکھنے والوں کو ہلاک کر دے
بازو مکھن سے تراشے ہوئے۔ سینہ جیسے گنگا کے گھاٹ کا سنگ مرمر
ہیر شاہ پری کی بہن تریج پھول رانی ہے جو ہزار عورتوں میں کھڑی ہو تو بھی چھپائے نہیں چھپتی۔
سہیلیوں کے ساتھ غرورِ حسن سے اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہوئی جیسے ڈری ہوئی ہرنیاں
وہ لنکا کے باغ کی پری ہے اندرانی ہے یا حور ہے جو انوار کے پردوں سے نکل آئی ہے
چین کی پتلی ہے یا روم کی تصویر ہے یا پری ہے جو چاند کی طرح سُندر ہے۔
ہیر کی زیبائش کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں ؎

ہیر نہا کے پٹ دا پہن تیور والیں عطر پھلیل لگاوندی اے
وَل پا کے مینڈھیاں خونیاں نوں گورے مکھ تے زلف پلماوندی اے
کجل بھنڑے نین اپرادھ لٹے دوجے حسن دے کٹک لے دھاوندی اے
دل کے وِشناں ہونٹھاں تے لا سرخی نواں ٹھاٹھ تے ٹھاٹھ چڑھاوندی اے
پا جھانجراں لوہڑے مرے چڑھ کے ہیر لنک دے نال چھنکاوندی اے
ٹکا بندی بھیب رہے نال لوہلاں وانگ مور دے پائلاں پاوندی اے
ہاتھی مست چھٹا چھنا چھن چھنکے قتل عام خلقت ہندی جاوندی اے
نین مست تے لوٹ وندا ڑے وا شاہ پری دی ہوش گواندی اے

رنگ پور کی حسین عورتوں کے عشوہ و ادا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مار عاشقاں دے کرن چا پیرے نین بھکھڑے نوک کٹاریاں دے
دیہن عاشقاں نوں توڑدے نال نیناں نین رہن ناہیں ہریاریاں دے

ایسی جوبن دے خاص ونجاریاں نوں ملے آن بیپاری نے یاریاں دے
سُرمہ پھُل ڈنڈاسڑا سُرخ مہندی لُٹ لے نے ہٹ پساریاں دے
ہُنیاں نال کلیجڑا کھچ کڈھن دتن بھولڑے مکھ بیچاریاں دے
سوہے سُرخ سالو پیتمین جوڑے رنگا رنگ سنگار منیاریاں دے

کہتے ہیں کہ ظاہر میں بھولی بھالی دکھائی دیتی ہیں لیکن تیرِ نگاہ سے چاہنے والوں کے جگر چاک کر دیتی ہیں۔ چہرے پر بھولپن ہے نگاہیں قاتل ہیں۔

وارث شاہ کو عورتوں کی زبان لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے مثلاً ملکی اپنی بیٹی ہیر کو سرزنش کرتی ہوئی کہتی ہے کہ تو مجھے اس ڈھٹائی سے جواب دیتی ہے جیسے لوہاروں اور ترکھانوں کی بیٹیاں ماں باپ سے گستاخانہ سوال و جواب کرتی ہیں۔ بے حیائی کی باتیں تو موچیوں اور دھوبیوں کی لڑکیوں کو زیب دیتی ہیں۔ تیری عادتیں کمین عورتوں جیسی ہیں۔ تجھ میں کوئی شریفانہ وصف نہیں ہے اور عاقل و بالغ ہو کر تو بچیوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ ؎

کرن ماپیاں نال جواب ساویں کُڑیاں بھٹ لوہار ترکھانیاں نی
نال حیاوڑاں کرن فضول حرکت کُڑیاں دھوبناں تے مُچیانیاں نی
عاقل بالغ مٹیار جوان ہو کے گلاں کریں توں وانگ ایانیاں نی
کوئی چال اشرافاں دی پکڑ دھیئے توبہ کرن تیتھوں کمین آنیاں نی

ہیر رانجھے سے ملنے سے باز نہ آئی تو ملکی کا غصہ بھڑک اُٹھا اور خاص دیہاتی زبان میں سے طعنے مہنے اور اُلاہنے دے دے کر دھمکانے لگی ؎

گھریں آئی جاں رانجھے توں ودع ہو کے "کائی کریں حیا" میں کہے مائی
مینوں ساڑیا لوکاں دیاں طعنیاں نے لوئی شرم دی مکھ توں لاہ لائی
مار ڈکرے کرن گے وڈھ تیرے جو چاک باپ تے سکا سلطان بھائی
اُڈار بیے جنگل اودیئے نی ساڈے سر تُوں ایہ کی خاک پائی

ملکی آکھدی بھیڑا پٹھے نی گلاں کریں توں بہت بربادیاں نے
تینوں پیہن پکان دا چا تینوں اساں پکیاں تے قسّاں کھادیاں نے
پھُل بھجیا سی کنڈے اُگ پئے واہ واہ ایہ قسمتاں ساڈیاں نے
بیبا مُول نہ چنگیاں لگدیاں نے سانوں ایہہ جو تیریاں وادیاں نے
چُوری کُٹ کے اُٹھ کے نت بیلے جاویں رانجھے دے پاس جیوں ڈادیاں نے
وارث شاہ جو دِھیاں نہ کہن لگن جانوں دِھیاں ناہیں مالزادیاں نے

ہیر پر پھر بھی اثر نہ ہوا تو ملکی کے لب و لہجہ میں مزید تلخی آگئی ؎

تینوں ڈونگرے کھوہ وچ جا بوڑاں کل پٹیوئی بچی میریئے نی
دھی جوان جے نکلے گھروں باہر لگے داہ تے کھوہ نگھیریئے نی
کونل وانگ پھریں توں وچ بیلے آٹھیر نہ کستد وچھیریئے نی
جتنا ورجیا اتنا مرے چڑھیوں توں تاں ہوئی ایں شوخ وچھیریئے نی

ہیر نے پھر بھی ماں کا کہنا نہ مانا تو ملکی نے غضب ناک ہو کر اسے بے نقط سنائیں اور بے تحاشہ گالیاں دیں۔ ؎

ہیر ماں نوں آن سلام کیتا ماؤں آکھدی آؤ نی نہُریئے نی
اُرد بیگنے تے مال زادیئے نی غُصے ماریئے زہر دیئے زہریئے نی
ڈر بولئے گولئے بے حیائے گھنڈ وٹیئے گلہ ٹھپریئے نی
او دھلا گنے لوہیئے کڑسنے نی چھیل چھدیئے چھنیئے چتریئے نی
توں اکا ٹکیے ساڑ کے روڑ دِتا لنگ گھڑ دنگی نال متھریئے نی
ہُن آکھنی ہاں ٹل جا ساتھوں جھڑ رانجھے دے نال ٹیئے مہریئے نی۔
نال ساہناں دے پھریں دن رات کھیندی تراحال ایہو اُٹھے پہریئے نی
اج رات تینوں مجھو واہ بوڑاں ساعت آوندی لے تیری قہریئے نی

خیال رہے کہ ملکی نے اپنی بیٹی کو پہلے احسن طریقے سے سمجھایا لیکن جب وہ باز نہ آئی تو اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ خفگی اور غضبناکی کے ان مدارج کو وارث شاہ نے نہایت چابکدستی سے دکھایا ہے۔

ملا ہر کہیں ایک جیسی زبان بولتے ہیں۔ لیکن دیہات کے مُلا کی زبان میں خاص کرارا پن ہوتا ہے۔ رانجھا گھر سے نکلا تو پہلی رات ایک مسجد میں بسر کی جہاں کے مُلا نے سرزنش کرتے ہوئے کہا ے

مُلاں آکھیا او نامعقول جٹا فرض کج کے رات گذار جائیں
فجر ہُندی توں اگے ای اُٹھ ایتھوں نکل مسجدوں فیر نہ جھات پائیں
کوئی بدعتی توں نظر آوندائیں ایسے وقت ای دُور ضرور ہووئے
خراباتیاں دی نہیں جا گھ ایتھے یاد رب دا جِت مذکور ہووئے
تارک ہو صلوٰۃ دا پٹے رکھیں داڑھی مُنیاں مار پچھاڑ دیئے او
جیواں کپڑا ہووے تے پاڑ دیئے لمباں ہوں دراز تے ساڑئیے او

مُلا کے ڈر سے رانجھا پو پھٹتے ہی جاگ اُٹھا اور پتن پر پہنچا۔ لُڈن ملاح سے کہا مجھے بھی دریا کے پار لے چلو۔ لُڈن کو معلوم ہوا کہ اس کی جیب خالی ہے تو کہنے لگا ے

پیسہ کھول کے ہتھ جے دھریں ساڈے گودی چاہڑ کے پار اُتار نے ہاں
اجے ڈھیکیا مُفت جے کن کھائیں چا بیڑیوں زمیں تے مارنے ہاں
جنا کپڑا دیئے تے نقد ساڈوں سمجھو او سدے کم سوارنے ہاں
چور دھاڑوی آکے ٹُب دیوے اُسیں اوسدے بھی پردہ دارنے ہاں

راقم کا گاؤں لبِ دریا واقع ہے اس کے گاؤں میں ملاحوں کا ایک محلہ بھی ہے۔ وارث شاہ نے ملاحوں کی خالص زبان لکھی ہے۔ لُڈن سچ کہتا ہے کہ ہمیں چور اور ڈاکو لالچ دیں تو ان کو بھی پار لے جاتے ہیں اور ان کی پردہ داری بھی کرتے ہیں۔

وارث شاہ نے دیہات کے مکتب کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی لڑکا ع کی جگہ غ لکھے تو مُلّا گریج کر وہ ڈمنٹ پلاتا ہے کہ بچّے کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ کچھ لڑکے تو صبح سویرے جُزدان لے کر مکتب جاتے ہیں اور کچھ پُھپھنتے مُلّا کی دھمکیوں کے ڈر سے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں خوش قسمت ہیں وہ طالب علم جنھوں نے استاد کی سرزنش کے مصائب جھیلے ہیں ؎

اک عین کے رغ داغ لکھدے مُلّاں جندکڈھے نال کرڑکیاں دے

اک آوندے شوق جزدان لے کے وتج مکتباں دے نال تڑکیاں دے

اک نال پربھات دے نس جاندے مائے خوف وریڑیاں ڈرکیاں دے

وارث شاہ دھن بھاگ سہاگ تنہاں جھلے دکھ استاد دے دھڑکیاں دے

دیہات میں دستور تھا کہ جب کسی کو منانا ہوتا تھا تو منانے والا گلے میں پٹکا ڈال کر اور منہ میں گھاس لے کر جاتا تھا ؎

گلیں پا پلاّ مونھ گھاہ لے کے پیریں لگ کے پیر منائیے نی

جاٹ خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اپنے چوتڑوں پر دونوں ہاتھ مارتے ہیں۔ جیسے طبلہ بجایا جاتا ہے ؎

اک چتڑ وجاندے جا من ہسنے بھلا ہویا فقیر دی آس ہوئی

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وارث شاہ نے فن کارانہ ہنرمندی سے پنجابی دیہات کی عکاسی کی ہے۔

وارث شاہ کی تمثیلوں، تشبیہات اور تلمیحات میں بھی دیس پنجاب کی مٹی کی بُوباس رچی ہوئی ہے جس نے ان کے اسالیبِ بیان کو فطری شگفتگی اور تازگی عطا کی ہے۔ وُہ روزمرہ کی دیہاتی زندگی سے اپنی تمثیلیں اور تشبیہات اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً جوگی بن کر آنجھے کے حصولِ مُراد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا مایوسی کے بعد کامرانی سے شادکام ہونا ایسا ہی ہے جیسے شور بنجر میں باغ لگا دینا، بُھنے ہوئے دانوں کا اُگ آنا ؎

جدوں جوگی تے رب دی مہر ہوئی کلر شور وچ باغ لوایائی

دیکھو کرم سوڑے راںجھنے دے کھیت جمیاں بھنیاں دانیاں دا

لوگ خود احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں اور الزام شیطان پر رکھتے ہیں ؎

وارث شاہ شیطان بدنام کر سو لُون تھال دیوچ بھنایائی

"نمک تھال میں کوٹنا" احمقانہ حرکت کے لئے محاورہ ہے۔ ظاہر ہے تھال ٹوٹ جائے گا

ہیر کہتی ہے کہ میں اپنے شوہر کی ایسی ہی دشمن ہوں جیسے کہ جولاہے ریشم کے دشمن ہوتے ہیں۔ ؎

میری خاوند دے نال اجوڑ ایویں دیر ریشماں نال جولاہیاں نوں

جولاہے ریشم کا کپڑا بننے سے پہلے ریشم کے دھاگوں کو خوب کوٹ پیٹ کر صاف کرتے ہیں۔

دیہات میں عورتیں دھان کو پہلے اوکھلی میں کوٹتی ہیں اور پھر چھاج سے چاول بھوسی سے جدا کرتی ہیں ؎

چاول عشق دے جگر دی اُکھلی چھٹیں چھجلی نیناں دی نال کلاوندائی

کہتے ہیں کہ رانجھا اپنے جگر میں عشق کا دھان کوٹتا ہے اور آنکھوں کے چھاج سے انہیں بھوسی سے جُدا کرتا ہے۔ جگر اور آنکھوں کا تعلق عشق سے واضح ہے۔

رانجھا جوگ لینے بالناتھ کے پاس گیا تو اس نے ذکر اذکار سے نفس کی سرکشی پر قابو پالیا۔ یہ مضمون وارث شاہ اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

وگڑے جٹ دے منہ لگام دے کے دیوا صبر دا دلے وچ بالیاسو

سُنداں ذکر دیاں بنھ کے نفس اُتے اوہدے جُسّے دا کھوہ گھڑ بالیا سُو

ذکر کو سُنڈوں سے اور رانجھے کے جسم کو رمبٹ سے تشبیہ دی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ بالناتھ نے رانجھے کی تربیت اس طرح کی جیسے سُنار سونے کو پگھلا کر اور کوٹ پیٹ کر زیور بناتا ہے۔ ؎

ہتھ کھپری سمرنا نا دسنگی اسم الکھ دا جا سکھالیا سُو
وارث شاہ سُنیار دے وانگ گھڑ کے جٹ فیر مُڑ بھنگے گا لیا سُو

جب رانجھے نے بالناتھ کی یہ نصیحت ماننے سے انکار کر دیا کہ عورتوں سے کوئی واسطہ نہ رکھنا تو گرو پچھتانے لگا کہ میں نے اس لڑکے کو جوگ کیوں دیا۔ کہتا ہے ؎

جوگ مینڈھڑے کھیت کماوے تے ایہ بالکا غیب دا پیا نیلا

نیلا ایک کیڑا ہوتا ہے جو نیشکر کی فصل کو تباہ کر دیتا ہے۔

رانجھا رنگ پور پہنچا تو عورتیں ہجوم کر آئیں۔ پردہ دار عورتیں بھی جوگی کو گلی میں سے گزرتے ہوئے چوری چھپے دیکھنے لگیں اور اس کی باتیں کرنے لگیں۔ اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔ ؎

ستردار ایہو پنجرے وچ پیاں وانگ بُود سنے اج پتاکیاں نے
چوری گھنڈ دے وچ ہُن تاڑیا نے چوہے وانگ ہُن گھنڈ تھیں جھاکیاں نے

کہتے ہیں کہ پردہ دار عورتیں اس طرح باتیں کرنے لگیں جیسے بُودنہ (بودنہ بٹیرا) بولتا ہے اور اپنے نقابوں میں سے نظریں چرا کر جوگی کو یوں دیکھا جیسے چوہے بلوں میں سے جھانکتے ہیں۔

رانجھا راجہ عدلی سے شکایت کرتا ہے کہ کھیڑوں نے میری جوگن چھین لی ہے۔ ؎

میتھوں کھوہ فقیری اُٹھ نٹھے جیویں پیسیاں نوں ڈوم شادیاں دے

کہتا ہے ان لوگوں نے مجھ سے جوگن یوں چھین لی جیسے ڈوم شادی کے موقع پر پیسے لے بھاگتے ہیں۔

ہیر جدائی کے کرب میں اپنی بے بسی کا ذکر کرتی ہے۔ ؎

ہیر نال فراق دے آہ ماری ربا ویکھ اساڈیاں بھکھن بھاہیں
اُگے اگ پچھے آب سنیھ پاسیں ساڈی واہ نہ چلدی چوہیں راہیں

کہتی ہے کہ میرے سامنے آگ ہے پیچھے پانی ہے دونوں طرف شیر کھڑے ہیں۔ میں چاروں طرف سے مصائب میں گھر گئی ہوں

ہیر رانجھے کے وصل سے فیض یاب ہو کر گھر لوٹی ؎

وارث شاہ سُہاگے تے اَگّ داگُوں سونا کھیڑیاں دا سبھو گال آئی

کہتے ہیں جیسے آگ پر تپایا ہوا سونا سہاگہ ڈالنے سے گل جاتا ہے ایسے ہی ہیر کے ہاتھوں کھیڑوں کی عزت گل گئی۔

دُودھ میں آک کے دو ایک قطرے ڈالنے سے دُودھ پھٹ جاتا ہے ؎

ہیر آکھدی کیتائی بُرا ماہی تیری مست نوں کون لے جاوندائی

دیسی سُتّیاں کلاں جگا لنگا اَک دُودھ دے وِچ چوادندائی

اس میں دو محاورے باندھے ہیں۔ سُتّیاں کلاں جگانا کا مطلب ہے فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کرنا اور دُودھ میں آک چوانا رنگ میں بھنگ ڈالنا۔ یہ وہ مقام ہے جب کیدو بھکاری کے بھیس میں رانجھے سے ہیر کی دی ہوئی چُوری لے جاتا ہے۔

بعض لوگ اپنے دوستوں کو مصیبت میں ڈال کر خُود بھاگ جاتے ہیں۔ رانجھا اپنی بھاوج کو طنزاً کہتا ہے ؎

ایویں عیب دیاں تہمتاں جوڑ کے تے کجھ جھوٹ نہ سچ نتارنی ایں

اُتّے چاہڑ کے پوہڑیاں لالیویں کیہے کلا وے محل اُسارنی ایں

کہتا ہے کہ تو اُن لوگوں کی طرح ہے جو دوسرے کو مکان کی چھت پر چڑھا کر نیچے سے زینہ کھینچ لیتے ہیں۔

کیدو نے رانجھے اور ہیر کے معاشقے کا ذکر دارے میں بیٹھ کر کیا اور انھیں خُوب رُسوا کیا۔ اپنے اس کارنامے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

گل آکھی سی سو میں آکھ چھڈی ڈھولی ڈھول نوں جویں وجاندائی

ڈھول کی آواز دُور دُور تک جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے اپنی بات سب کو پہنچا دی ہے۔

بیدانہ ایک مٹھائی ہے اس کے ذائقے کا ذکر کرتے ہوئے وارث شاہ کہتے ہیں ؎

گپ چپ بیدانیاں سواد چنگے جیوں پیارے محبوب دے بوسیاں دے

ناز و ادا کے بغیر رنڈی بے جان کٹھ پتلی کی طرح ہے۔ اور عقل کے بغیر مرد گدھے کی مانند ہے ۔ ع

ناز بناں ہے کنجنی باجب جیسی مرد گدھا جو عقل شعار نا ہیں ۔

بعض بھاوجیں اپنے دیوروں سے بڑا پیار کرتی ہیں ۔ ع

میدہ کھنڈ تے گھیو یار ہے جیہی بھابی لاڈلی نال جیوں دیوراں دے

کہتے ہیں کہ مٹھائی میں میدہ کھانڈ اور گھی اس طرح یک جان ہو گئے ہیں جیسے لاڈلی بھابی دیوروں سے گھل مل جاتی ہے ۔

بعض عورتیں مردوں کو اس طرح کنگال کر دیتی ہیں جیسے اناڑی نائی کی قینچی داڑھی مونچھ کا صفایا کر دیتی ہے ۔ ع

لباں بیدیاں ای صاف کر دیہن جویں قینچیاں احمقاں نائیاں دیاں

جٹیوں کے سڈول اور ترشے ہوئے جسموں کا ذکر کرتے ہیں ۔ ع

کیکیہ کراں تعریف جٹیاں دی جویں خرادیاں ڈبیاں لاہیاں نے

کہتے ہیں لگتا ہے جیسے خرادیوں نے ڈبیاں بنا کر رکھ دی ہوں ۔

رانجھا جوگی بن کر رنگ پور گیا تو راستے میں اسے ایک گڈریا ملا جس نے اسے پہچان لیا اور کہنے لگا تم وہ کام کرنے جا رہے ہو جو سیدا کھیڑا سر انجام نہیں دے سکا ۔ ؎

لگا ہیر نوں جن جو عشق والا سنگل نال تدبیر دے کڈن لگوں

جہڑا سیدے تھیں مول نہ گیا چھڑیا اُس جھنگنے نوں اج توں چھڑن لگوں

کہتا ہے ہیر کو عشق کا جو جن چمٹا ہوا ہے اسے تم تدبیر کی زنجیر میں جکڑنے جا رہے ہو اور جو بھونا چاول سیدا کھیڑا کوٹ پیٹ کر صاف نہیں کر سکا اسے تم کوٹنے جا رہے ہو یعنی ہیر جسے سیدا رام نہیں کر سکا اسے تم رام کرو گے ۔

رانجھے جیسے جوان رعنا کو دیکھ کر رنگ پور کی عورتوں کی جو کیفیت ہوئی اسے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

واہنگ مصرناں ریجھیاں ویکھ یُوسف بھُلی عقل تے گتوں بے گت ہویاں
سُن قند نبات سُن جوگڑے دا گڑیاں سُندیاں ای دُدھ بھت ہویاں

جس طرح زنان مصر حسن یوسف کے نظارے سے حواس کھو بیٹھی تھیں۔ یہی حال رنگ پور کی عورتوں کا ہوا۔ ان کے ہوش جاتے رہے اور حواس قائم نہ رہے۔ جیسے ناچنے والی رنڈی گت توڑے کا ساتھ نہ دے اور اس کے پاؤں بے گت پڑنے لگیں اور جب رانجھے نے اُن سے میٹھی میٹھی باتیں کیں تو وہ سُنتے ہی از خود رفتہ ہوگئیں۔ قند نبات کی رعایت سے دُدھ بھت لائے ہیں۔ نہایت شگفتہ اندازِ بیان ہے۔

بھتی مُراد بلوچ سے اپنے پیار کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے۔ ؎

ایس عشق دے روگ نے ہڈ گالے ہوئی کندھ دا گھوں ڈھیے کھُرنیاں میں

عشق کے مرض نے گھن کی طرح مجھے چاٹ لیا ہے جیسے کمزور دیوار بارش کے پانی سے اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہے۔

ماہیے کا ایک بول ہے۔ ؎

ڑیاں سندر دیاں تیئیں کی جانڑوں مرضاں کھا گیاں اندر دیاں

جب ملکی نے ہیر کو سرزنش کی اور اسے سیدے کھیڑے سے بیاہنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہیر نے کہا ؎

کھن نذر رنجھیٹے دی اساں کیتا سنجی ماں کیوں چھاچھ نوں رولدی اے

کہتی ہے آغاز شباب کا مکھن تو رانجھا کھا گیا ہے اب چھاچھ کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے جسے میری ماں بلونا چاہتی ہے

ایک جگہ کہتی ہے۔ ؎

رانجھا ڈھونڈھ قدیم دا یار میرا چونڈیاں کواردیاں جنھیں کھولیاں نے

یعنی رانجھا میرا پرانا دوست ہے جس نے میری دوشیزگی غارت کی تھی۔

ہیر رانجھے سے کہتی ہے ؏

روز ازل تھی سجناں نال تیرے پکی جکڑ کے رب نے جٹیاں میں

کسی اتھرے مویشی کو بھاگ دوڑ سے روکنے کے لئے جاٹ اسے کسی طاقتور بیل یا بھینسے سے جکڑ دیتے ہیں جس سے وہ ہل جل نہیں سکتا۔ اسے پنجابی میں جُٹناں کہتے ہیں۔ ہیر کہتی ہے مجھے تو روز ازل سے تیرے ساتھ جکڑ دیا گیا ہے

ہیر جدائی کی حالت میں نالہ کناں ہے۔ ؏

کُونجی وانگ دن رات کرلاؤندی نوں پیا وچ کلیجڑے گھا میئوں

کونجی ایک آبی پرندہ ہے جو پانی کی سطح پر پہروں منڈلاتا رہتا ہے اور اپنا عکس دیکھ دیکھ کر چیختا رہتا ہے۔ ہیر کہتی ہے۔ میں بھی کونجی کی طرح چیختی رہتی ہوں

عورتیں کسی چھیل چھبیلے گھبرو کو دیکھ کر اس طرح اُس پر گر پڑتی ہیں جیسے مکھیاں شہد پر گرتی ہیں ؏

رناں ڈگدیاں دیکھ کے چھیل منڈا جیویں شہد وچ پھسدیاں مکھیاں نے

رانجھے نے مکروفریب سے بالناتھ جوگی سے جوگ لیا۔ وارث شاہ کہتے ہیں۔ ؏

ٹھگی مار کے جٹ نے داؤ بھریا بالناتھ جیہا سنڈھا چویا ئی

کسی ناممکن کام کو ممکن کر دکھانے کے لئے پنجابی کا محاورہ ہے سنڈھا چوناں۔ ظاہر ہے کہ بھینسے کے دودھ نہیں ہوتا۔

ہیر بڑی شوخ اور تیز طرار لڑکی تھی۔ رانجھے نے بڑے پیار سے پچکار کر اُسے رام کیا تھا۔ وارث شاہ خاص دیہاتی زبان میں اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

وچھیری الک نوں جاک نے زیر کیتا دے کے نال پیار دے تھاپڑی اے

پھر نال پیار پچکار اُسنوں گھتی پشت اُتے چینگی باکھڑی اے
وت نال دلاسے دے پاشنگری چڑھیا اوس تے مار پلاکڑی اے
نہیں چاک دا ساک اج وِچ سیالاں صرف ہیر ای سنگدی ساکڑی اے
صرف عشاق ہی پیار کے رموز جانتے ہیں ؎
وارث شاہ میاں جنہاں لائیاں نیں سوای جاندے گوہڑیاں یاریاں نوں
جب ہیر نے یہ بہانہ کیا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے تو اس نے جو حالت بنائی
اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں ؎
ونڈ میٹ گھسیٹ کے بڈ گوڈے چتے ہوٹھ گھماں کر تیلیاں نی
نک چاہڑ دندڑکاں وٹ رووے کڈھ اکھیاں نیلیاں پیلیاں نی
یہ شعر حسنِ بیان، دقتِ مشاہدہ اور قدرتِ کلام کا ایک نادر نمونہ ہے۔
کہتے ہیں کہ جو نوجوان عورتوں کے شوقِ عشق میں مبتلا ہیں وہ نچلے نہیں بیٹھ سکتے؎
وارث شاہ نہ رہن نچلڑے اوہ جنہاں نراں نوں شوق نے ناریاں دے
بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیز گار بن بیٹھتے ہیں۔ طرزِ بیان کی بھوگی قابلِ داد ہے ؎
بڈھا ہوئے کے چور مسیت وڑدا رل بہوندا ہے نال مداریاں دے
گنڈی رن بڈھی ہوندی جا جن پھیرے مور چھل گرد مزاریاں دے
بالناتھ جوگی رانجھے کو تلقین کرتا ہے کہ دیکھنا عورتوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔ رانجھا کہتا ہے ؎
رناں دیہن گالیں اسیں چپ کریئے ایڈے صبر دے پیر کس دھوونے نی
تساں ستوں کھیڈنوں منع کیتا اساں دھوئیں دے گوہے نہ ڈھوونے نی
کہتے ہیں کہ عشق میں مبتلا ہو کر آدمی از کار رفتہ ہو جاتا ہے ؎
وارث شاہ میاں جس نوں عشق لگا دین دنی دے کم تھیں جا رہیا
یہ تمام تمثیلیں اور تشبیہات پنجاب کے دیہات اور اس کی روزمرہ زندگی سے لی گئی ہیں

جس سے 'ہیر وارث شاہ' میں بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

'ہیر وارث شاہ' کے صفحات میں جا بجا دانش و حکمت کے موتی بکھرے پڑے ہیں لیکن یہ کتابی دانش نہیں ہے بلکہ وہ حکمت ہے جو بھوری زمین سے دن رات وابستہ رہنے والے دیہاتیوں کو ودیعت ہوتی ہے۔ اور براہ راست ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ شہر کے لوگ دیہاتیوں کو سادہ لوح سمجھتے ہیں لیکن جہاں تک فہم عامہ کا تعلق ہے شہری دیہاتیوں کے سامنے طفلانِ مکتب ہیں۔ کتابوں سے دانش و حکمت کے مقولے یاد کر لینا اور بات ہے اور فطرت کی گود میں پل کر تجربات اخذ کرنا شئے دیگر ہے۔ وارث شاہ کے ان حکیمانہ مقولوں کو ماحول کی یگانگت نے تازگی اور گہرائی عطا کی ہے۔ چند نمونے درج ذیل ہیں۔

ع ککھاں وچ انگیار نہ کدی لُکدے لگی اگ نہ چھپدی چھپن ہیرے

تنکوں میں انگارے نہیں چھپائے جا سکتے۔ یعنی عشق کا راز چھپانا مشکل ہے

ع وارث شاہ اجاڑیاں رب دیاں نوں ہتھیں اپنے پھیر اجاڑناں کی

جنھیں خدا نے تباہ کیا انھیں ایذا پہنچانا کسی کو زیب نہیں دیتا۔

ع وارث شاہ سب عیب دا رب محرم ایویں سانگ ہے پگڑیاں پولیاں دا

خدا ان بڑے بڑے عمامے باندھنے والوں کی ریاکاری اچھی طرح جانتا ہے۔

ع جیتاں ہنگ دے نرخ دی خبر ناہیں کاہ پچھنے بھاہ کستوریاں دے

ہینگ کا بھاؤ معلوم نہ ہو تو کستوری کا نرخ دریافت کرنا کیا ضرور۔

ع جٹرے ہون بے عقل جا لاوندے نے اٹ باریاں دی نال موریاں دے

احمق بے جوڑ شادیاں کر دیتے ہیں۔ صحبتِ ناجنس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ع نال بھوریاں ریشماں میل کیہا ساتھ اُت دے میل کی پونیاں دا

ع جھگڑا پیر ہے احمقاں ہوچھیاں دا عقل پیر ہے اہل قیاسیاں دا

احمق اور اوچھے جھگڑالو ہوتے ہیں۔ عاقل با شعور ہوتے ہیں

ع کسے کانواں دے ڈھور نہ کدی مردے شیر بلیاں نہیں فنگار دے نے

اہلِ غرض کی دعا اثر نہیں کرتی۔ پنجابی کی ایک کہاوت ہے۔ "چوہڑیاں آکھیاں ڈنگر نہیں مردے۔"
جو کنواریاں لڑکوں سے کھیلیں وہ لازماً خراب ہو جاتی ہیں۔

ع اوہ کنواریاں جان خراب ہویاں جہڑیاں منڈیاں نال کھیڈیندیاں نے

کنجر اور بھڑوے پیسے سے غرض رکھتے ہیں۔ سرکش عورت کا علاج جوتا ہے۔

ع پیسہ پیر ہے کنجراں بھڑویاں دا چھتر پیر رناں چوڑ ناسیاں دا

چوری، یاری اور ٹھگی چھپی نہیں رہتیں۔ چغل خور کی زبان کی طرح چاہنے والوں کی آنکھیں
بھی غماز ہوتی ہیں ؎

بھس جھڑدے تے چغل دی جیبھ وانگوں گجھے رہن نہ دیدڑے یار دے جی
چور یار تے ٹھگ نہ رہن گجھے کتھوں چھپن اے آدمی کار دے جی

جس طرح کھانگڑ بھینس کا دودھ مزہ دیتا ہے اسی طرح کنوارے ہم عمروں کا پیار
پُر لطف ہوتا ہے۔

ع دھاراں کھانگڑاں دیاں جھوکاں ہانیاں دیاں گھول کواریاں دے مزے یاریاں دے

پیٹ بھرے جاٹ۔ کمبوہ اور بھینسے بُرے ہوتے ہیں۔ بھوکے باز بُرے ہوتے ہیں۔ جوئے
کی ہار، ناشکری اور پہاڑ کا سفر بھی بُرے ہوتے ہیں۔ ؎

سنڈھا، جٹ، کمبوہ ایہ بُرے رجے بھکھے بُرے نے باز کراڑیے دے
بُری جوئے دی ہار تے ناشکری بُرا راہ ہے وچ پہاڑیئے دے

دشمن ایسا ہے جیسے آستین کا سانپ یا گڑی میں چنگاری

ع سپ وچ آستین دے سمجھ دشمن وچ بگ دے اگ چنگاریئے دے

فارسی میں کہتے ہیں ع چہ داند بوزنہ لذتِ ادراک۔ وارث شاہ کہتے ہیں

ع جیہڑیاں سون اجاڑ وچ وانگ کنجر قدراں اوہ کی جاندیاں دائیاں دیاں

جو عورتیں کنجروں کی طرح جنگلوں میں بچے جنتی ہیں وہ دایہ کی قدر کیا جانیں۔ ایک جگہ کہا ہے

ع جیہڑے داہن پڑانیاں وِچ لیٹن قدراں پان کی لیف تلائیاں دیاں

جو زمین پر لیٹتے ہیں وہ لحاف کی قدر کیا جانیں۔

کسی لٹیرے کو مال و دولت کا محافظ بنانا ایسا ہی ہے جیسے بھینسے کو سرسبز کھیت میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ~~

سارا مُڑک کے کھیت خراب کیتا سنڈھا فصل دے وِچ نال سبب گیا
راکھا مال دا رکھیا دھاڑوی نوں چُٹن کے نال چنگا سارا دب گیا

نادان پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے پتھر کو زنگ نہیں دیا جاسکتا

ع وارث شاہ نہ سنگ نوں زنگ آوے لکھ سوہے دے وِچ ڈبو رہیئے

انسان خاطی ہے اور شروع سے خطا کرتا آیا ہے کیونکہ وہ کچا دودھ پیتا ہے۔

ع کچا شیر پیتا بندہ سدا بھلا دُھروں آدموں بھلنّاں راہ ہویا

جن سے پیار کیا جائے اُن کو دھتا نہیں بتانا چاہیئے۔ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پیڑ کو کاٹنا زیادتی ہے۔

ع بوٹا ہتھ دے نال جو لا دیئے ہتھیں ناہ مُنڈیئے واسطا ئی

ایک اور جگہ کہتے ہیں

ع دھرت نال نہ ماریئے پھیر اُنہاں ہتھیں جنہاں نوں چاہڑیئے گھوڑیئے نیں

جنھیں اپنے ہاتھ سے گھوڑے پر سوار کرایا جائے انھیں زمین پر نہیں پٹک دینا چاہیئے۔

بُری عادات باقی رہتی ہیں۔ خواہ کتنا ہی تشدد کیا جائے۔

ع وارث شاہ بد عادتاں جاہن ناہیں بھاویں توڑ سائے بند بند کٹو

گیا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا جیسے گنگا میں بہائی ہوئی ہڈیاں واپس نہیں آسکتیں

ع گنگا ہڈیاں گیاں نہ مُڑ دیاں نے مُڑے وقت نہ گیا وسوریا جے

پھر کہتے ہیں ۔ وارث شاہ میاں اجتہاں وقت گھٹھا کیسے پیر نوں بھتھ نہ آوندا ئی

بُڈھے فاسق جیسا بے حیا کوئی نہیں ہوتا ۔

ع بڈھا ہو جوانی دے کم ڈھونڈے وانگ اوسدے کوئی بے نج ناہیں

محسن کُشی جوانمردی کے منافی ہے جس گھر سے کھایا جائے اسے ضرر نہیں پہنچانا چاہیئے ۔

ع وارث شاہ نہ اوسنوں مرد جانوں جس نے کھائیکے تھال وچ ہد یا ئی

تیز طبع لڑکی کو جلد بیاہ دیا جائے ۔

ع ہووے قدرتی طبع دی تیز لڑکی کریئے اوسدا کاج شتاب ہے نی

دوستوں سے بگاڑ اور احمقوں سے مذاق اچھا نہیں ہوتا ۔

ص کرنا دوستاں نال بگاڑ ہندا بُرا ہاسڑا نال اناڑیئے نی

لوگ حاسد ہوتے ہیں اس لئے اپنی خوش حالی کا راز فاش نہ کیا جائے ۔

ع وارث شاہ چھپایئے خلق کولوں بھاویں اپنا ای گڑ کھایئے نی

پیار اور دلاسے سے شوخ اور اکھڑ آدمی کو بھی رام کیا جا سکتا ہے ۔ اسے بے سبب تنگ نہیں کرنا چاہیئے ۔

ع نال پیار دے اُڑک دی ہلیں وگدے ایریں آر نہ دُبر وچ پوڑیئے جی

اُڑک وہ نوخیز بیل ہوتا ہے جو ہل چلاتے ہوئے رُک رُک جائے ایسے بیل کو چلانے کے لئے کسان اس کی دُبر میں سیخ چبھوتے ہیں ۔ وارث شاہ کا مطلب یہ ہے کہ پیار دلاسے سے کام لینا انسب ہے ۔

رزق کمانے کے لئے محنت کرنا ضروری ہے ۔ گھر بیٹھنے والے کو تو خیرات بھی نہیں ملتی ۔

ع جیلے رزق بہانڑے موت ہندی گھر بیٹھیاں کوئی نہ خیر پاندے

مکافاتِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آک کے بوٹے سے آم نہیں لگتے ۔ اور پھروانہہ کا درخت شہتوت کا پھل نہیں دیتا ۔

ع اک بیج کے کسے نہ اَنب کھادے پھر وا نہ شہتوت نہ لایائی

مُلّاؤں کی دُشمنی خطرناک ہوتی ہے جیسے کھلیان کے قریب آگ دبانا خدشناک ہوتا ہے۔

ع بُری دُشمنی نال مُلّانیاں دے آگ دَبنی کول کھلواڑیئے دے

مُلّاؤں کی دُشمنی اِس لئے خطرناک ہوتی ہے کہ وہ بات بات پر کُفر کے فتوے داغ دیتے ہیں۔ کسان کھلیان کے قریب حقّے کے لئے آگ دبا دیتے ہیں لیکن اس کی ایک چنگاری بعض اوقات سارا کھلیان جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

پیار کیا جائے تو اسے نبھایا جائے۔ لڑائی کی شروعات کی جائے تو میدانِ جنگ سے بھاگا نہ جائے۔ طوطے کو میٹھی چاٹ کا عادی کر کے بعد میں اسے کنکر نہیں کھلانے چاہئیں ؎

دعوے بنھیئے تے بِدھے ہولڑیئے تیر مار کے تِچھے نہ نھٹیئے نی

مِٹھی چاٹ پلائیکے طوطڑے نوں پچھوں کنکراں روڑ نہ سُٹیئے نی

ماہیئے کا ایک بول ہے ؎

مُنھ پاپیلاں ہائی وینڈے پُتّر اصیلاں دے مراں نال نبھائی ونیدے

ایک اور بول ہے ؎

کانا کھاری دا اوتھ راہ سُنّاں ایہہ دستور نہ یاری دا

وارث شاہ کہتے ہیں کہ معشوق کی فرمائش پوری کرنا پڑتی ہے اور حاکم کے حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔

ع وارث شاہ معشوق تے حکم والے جو کجھ کہن سو سب قبول ہے جی

خود داری کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے تو تجھے شہباز بنایا تھا تُو اپنے کرتُوتوں سے چیل بن گیا ہے۔

ع تینوں رب شہباز بنایا سی جنیوں کرنیاں نال نُوں اِل آپے

معمولی باتوں پر جھگڑنے والوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا

ع وارث شاہ اوہ کدی نہ اک ہوندے جنہاں وِیرنے توبیاں تراں دے نی

یعنی وہ لوگ جو اس بات پر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں کہ تو نے میری توری کیوں توڑی یا لکڑی کیوں کھائی۔

دشمن کو دل کا بھید بتانا ایسا ہی خطرناک ہے جیسے کہ کلہاڑے کی ضرب۔

ع ذاتی دشمناں دسناں بھید مندا بری سٹ ہے تبر کلہاڑ پئے دے

عورت کے لئے سوکن اور بھلے مانس کے لئے برا ہمسایہ جان کا روگ ہیں۔

ع سوکن رن، گوانڈ کپتیاں دتا بھلے مرد دے باب دا روگ ہے نی

حضرت داؤدؑ زرہ سازوں کے پیر تھے۔ ڈنڈا بگڑے ہوؤں کا مرشد ہے۔

ع سوٹا پیر ہے وگڑیاں تگڑیاں دا داؤدؑ ہے زرہ بناسیاں دا

رنڈی پر جان قربان کر دی جائے یا سارا مال لٹا دیا جائے تو بھی وہ جی جان سے پیار نہیں کرتی۔

ع جان مال دیجے لکھ کنجری تے کدی دلوں محبوب نہ عقیدیاں نے

جس طرح خوشحال خاں خٹک کی شاعری میں پٹھانوں کے کوہستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے اور شاہ لطیف بھٹائی کی کافیوں میں سندھی معاشرے کی جھلکیاں دیتی ہیں۔ اسی طرح وارث شاہ کی ہیر میں پنجابی دیہات کی زندہ تصویریں جھلملا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا نگارخانہ ہے جس کی تصویروں کے رنگ کبھی ماند نہیں پڑیں گے۔ بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نت نئی آب و تاب کے ساتھ نکھرتے جائیں گے۔

طنز و مزاح

کسی ستم ظریف نے انسان کو حیوانِ ظریف کہا ہے کیونکہ وہ اپنی خوشی کا اظہار ہنسی سے کرتا ہے۔ حیوانات میں صرف کُتا مُسکراتا ہے — دُم ہلا کر۔ جس طرح ہنسی کی کئی قسمیں ہیں۔ اسی طرح ظرافت کے بھی کئی مدارج ہیں۔ زہر خندہ کا تعلق ہجو سے ہے۔ ریشخند اور قہقہہ طنز پر لگایا جاتا ہے۔ اور مزاح کا اظہار مسکراہٹ، تبسم زیرِ لب اور شکر خند میں ہوتا ہے۔ ہجو کی تہ میں خشونت، عناد اور جذبۂ انتقام کارفرما ہوتے ہیں۔ طنز میں ایک گونہ جارحیت اور اذیت کوشی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ اور مزاح میں انسان دوستی اور ہمدردی کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ہجو بسا اوقات ظرافت کے حدود سے متجاوز ہو کر پھکڑ اور دشنام طرازی کے قریب ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات ہم صرف افراد کی ہجو سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ کسی معاشرے یا ادارے کی ہجو بدرجۂ اولیٰ ظرافت ہو جاتی ہے۔ مثلاً "ڈان کے ہوٹے" میں سروانٹیز نے غلط قسم کی شائستگی پسندی اور زوال پذیر تحریک جواں مردی کا خاکہ اڑایا ہے۔ ارسٹو فینیس، بوکاچیو اور سوفٹ نے اپنے اپنے عہد کے معاشرے کی ریاکاری پر چوٹیں کی ہیں۔ جی۔ بی شا اور الیسن نے جدید معاشر کی کھوکھلی قدروں کی تضحیک کی ہے۔ ان کے برعکس جوینال، سوزنی، فرزدق، جریر، انوری، اور سودا نے اپنے اپنے مخالفوں کی پگڑیاں اچھالتے وقت ان پر فحش پھبتیاں کسنے سے بھی دریغ

نہیں کیا۔ اور بعض اوقات اس طرح کھل کھیلے ہیں کہ ہنسنے کی بجائے ان کی سوقیت پر رونے کو جی چاہتا ہے۔

ظرافت یا خوش طبعی کی توجیہہ کرتے ہوئے فرائڈ کہتا ہے کہ ظرافت سے ہمیں جذباتی کشمکش سے نجات مل جاتی ہے اور ہنسی ہمارے جذباتی تشنج کو رفع کر دیتی ہے۔ آرتھر کوئسلر نے فرائڈ کے نظریہ ظرافت پر نقد لکھتے ہوئے کہا ہے کہ وہ "ظریفانہ اور المیہ، قہقہہ اور گریہ، مزاح اور فن کا ربط باہم معلوم کرنے میں ناکام رہا ہے چنانچہ وہ اس ربط کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس ربط کا راز "تعلق دو گونہ"[2] میں مخفی ہے۔ یعنی ہم کسی واردات کو دو متغائر پہلوؤں سے دیکھتے ہیں۔ جس طرح استعارے میں یہ تعلق (مستعار لہٗ اور مستعار منہ) کی صورت میں موجود ہے اسی طرح مذاق میں بھی یہ تعلق دو متغائر چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ فرائڈ نے بھی مذاق پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ لاشعوری واردات ایک دوسرے سے مختلف و متغائر ہوتے ہیں اور منتشر صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ مذاق کرنے والا چشمک برق کی تیزی سے متغائر واردات میں یہ تعلق معلوم کر لیتا ہے۔ اور اس تعلق کا انکشاف ہی مذاق کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ کوئسلر کہتا ہے کہ ایک ذہین طنز نگار یا مذاق کرنے والا لاشعوری واردات کے مختلف و منتشر واردات میں علائق و روابط معلوم کر کے بات کو ایسا موڑ دیتا ہے کہ اس میں ظرافت کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے، جس سے سامعین مسرت آمیز اچنبھا محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی مذاق میں مسرت اور حیرت کے یہ عناصر لازماً موجود ہوتے ہیں۔ کالنگ وڈ کے خیال میں مزاح میں المیہ اور مزاحیہ دونوں عناصر اس طرح پائے جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے[3]

"مزاحیہ افتاد طبع وہ ہوتی ہے جس میں ہم کسی ایسی کمزوری پر ہنستے ہیں جسے ہم حقارت کی نظر سے

---

[1] Insight and Outlook   [2] Bisociative

[3] Outline of the Philosophy of Art

نہیں دیکھتے" بلکہ اس سے دلی ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ کمزوری باقی رہے
ہم اس کمزوری سے پیار کرتے ہیں جیسی کہ وہ ہے۔ اس کے ساتھ ہم اس پر فوقیت محسوس کرتے
ہیں اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر و توانا سمجھتے ہیں۔ اپنی اس برتری اور توانائی کا احساس کئے
بغیر ہم اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ہم اس صدمے سے نجات پا لیتے ہیں کہ وہ کمزوری
ہے اور اس سے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مزاح میں غم اور یاسیت کا عنصر
بھی پایا جاتا ہے۔ مزاح قہقہے کی شائستہ صورت ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایسا فرحیہ
ہے جو المیہ کی حدود کو چھو لیتا ہے۔"

ظرافت انسانی کمزوریوں اور حماقتوں سے جنم لیتی ہے۔ کوئی شخص اتنا توانا نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور کوتاہی نہ ہو، اور کوئی شخص ایسا عقلِ کُل نہیں ہوتا کہ اس نے کبھی حماقت کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ عاقل و دانا خال خال ہوتے ہیں۔ حماقت تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ آئینہ دیکھتے وقت، عورت کے ساتھ تخلیئے میں ملاعبت کرتے وقت، غسل کرتے وقت اور بچوں سے باتیں کرتے وقت ہم سب احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں، اور یہی احمقانہ حرکتیں ہماری زندگی کو گوارا بناتی ہیں۔ اس شخص جیسا بدبخت، افسردہ طبع، کٹر اور بے رحم کون ہوگا جس نے کبھی کوئی احمقانہ حرکت نہ کی ہو۔

طنز و مزاح میں فرق یہ ہے کہ طنز کرنے والے میں دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہونے کا میلان موجود ہوتا ہے۔ ایسا شخص خود دلی مسرت اور سکون سے محروم ہوتا ہے اس لئے ہر وقت دوسروں کو بھی خوشی اور سکون سے محروم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس کی گفتگو میں تلخی ہوتی ہے تُنک ہوتی ہے، جارحیت ہوتی ہے۔ وہ ایک پھبتی سے ایک فقرہ چست کر کے مخاطب کو شکست دینے کی تاک میں رہتا ہے۔ جب اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے اپنی فاتحانہ برتری کا احساس ہوتا ہے۔ طنز کرنے والے اپنی غیر معمولی ذہانت اور درّاکی کے باوجود بالعموم تنگ دل، تنگ نظر اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ مزاح میں انسان دوستی کا عنصر لازماً موجود ہوتا ہے جس کے باعث اس میں طنز کی تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ مزاح میں دوسروں کے جسمانی نقائص یا

شکل و صورت اور لباس پر آوازے نہیں کسے جاتے بلکہ انسان کی عمومی کمزوریوں کا لطیف پیرائے میں مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مزاح نگار کسی فرد پر چوٹ کرے تو بھی اس فرد کی ایسی کمزوری پر چوٹ کرتا ہے جو اس میں اور دوسروں میں مشترک ہوتی ہے وہ اس کی مخصوص کوتاہی یا نقص پر تعریض نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح کرنے والے وسیع النظر، کشادہ قلب اور عالی ظرف ہوتے ہیں۔

طنز و مزاح کا اظہار بعض اوقات لفظی چھیل یا ضلع جگت میں ہوتا ہے الفاظ کے مفہوم اور فقروں کی ساخت کو اس طرح توڑا مروڑا جاتا ہے کہ ظریفانہ صورت احوال پیدا ہوجاتی ہے لکھنوی اس فن کے امام سمجھے جاسکتے ہیں۔ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو ضلع جگت کے بغیر بات ہی نہیں کرسکتے۔ اس نوع کی ظرافت کثرت و تواتر اور غلو سے بے مزہ ہوجاتی ہے اور اس پر حماقت کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ شیکسپیئر نے ایک مسخرے کی زبانی کہا ہے:

Better a Witty Fool Than a Foolish Wit [1]

ظرافت کی ایک قسم دفاعی ہوتی ہے اسے حاضر جوابی اور انگریزی میں Repartee کہا جاتا ہے۔ جو حضرات اس سے بہرہ ور ہوں وہ طنز کرنے والے کو ایسا موزوں اور دندان شکن جواب دیتے ہیں کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں سے برسرِ مجلس مذاق کرنا آ بیل مجھے مار کے مترادف ہے۔

جو انسانی کمزوریاں طنز و مزاح کا ہدف بنتی ہیں ان میں تین مغالطے ایسے ہیں جن سے کوئی بھی انسان بری نہیں ہے (۱) میں دنیا کا سب سے عقلمند آدمی ہوں۔ (۲) میں دنیا کا حسین ترین آدمی ہوں (۳) میں دنیا کا سب سے اچھا آدمی ہوں۔ ہماری اکثر کمزوریاں ان ہی کی فروع سمجھی جاسکتی ہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ شعروادب میں جن کمزوریوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے ان میں شیخی خوری، خودنمائی، باتونی ہونا، ڈینگیں مارنا، اپنی بہادری کا سکہ جمانا، مرد کا ہرجائی پن، عورت کی نشتر زبانی، پیٹ کا ہلکا ہونا، زن مریدی، دیوثی، لالچ، بخل، انانیت، ناشکرا پن

---

[1] Twelfth Night

خود غرضی، زر پرستی، بڑھاپے کا عشق، عورت کے سدا جوان رہنے کی کوشش، ریا کاری، زہد فروشی، شادی کے مزاحیہ پہلو وغیرہ۔ مزید وضاحت کے لئے ہم چند مطائبات درج کریں گے :

نائی بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک نائی نے حجامت بنانے سے پہلے آرکی لوگس شاہ مقدونیہ سے پوچھا :

"جہاں پناہ! حضور کی حجامت کس وضع کی بناؤں ؟"

"خاموش وضع کی" بادشاہ نے جواب دیا۔

فارسی اور اردو کے شاعروں نے بعض اوقات صنعتِ تجنیس سے لطافت و ظرافت پیدا کی ہے۔ اس صنعت میں دو الفاظ تلفظ میں مشابہ اور معنی میں مختلف ہوتے ہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے ایک شعر میں عورت پر چوٹ کی ہے ؎

زن بود در زبانِ ہندی نار وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

لفظ نار میں صنعتِ تجنیس ہے۔ عورت پر کیسے لطیف پیرائے میں چوٹ کی گئی ہے۔

ترکی کا ایک شاعر غزائی خاں کچھ مدّت ایران میں مقیم رہا۔ ایک رباعی میں ایران کے سیاسی استبداد پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

تا بودہ غم و شادی و حرماں بودہ زینگونہ گذشتہ تا کہ دوراں بودہ

ما تجربہ کردیم کہ در ملکِ شما راحت ہمہ در حلقۂ زنداں بودہ

کہتا ہے کہ ایران میں اگر کہیں سکون و عافیت ہے تو وہ صرف قید خانوں میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس ملک میں جور و استبداد کا دور دورہ ہو وہاں با اصول اور شریف انسان کا اصل مقام قید خانہ ہی ہوتا ہے۔

شادی شدہ آدمی کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے بیکن کہتا ہے :

"ایک شادی شدہ شخص اپنی بیوی سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو گویا وہ ایک ایسے قلعے کا محاصرہ

کررہا ہوتا ہے جس نے اپنے تمام دروازے پہلے سے کھول دیئے ہوں۔"

بالزاک ناتجربہ کار دولھا کے متعلق کہتا ہے :

"ایک ناتجربہ کار دولھا کا شادی کی رات کو اپنی دلہن سے اختلاط کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بندر کا وائلن بجانے کی کوشش کرنا۔"

زر پرستی کی ایک مثال اقلیدس کے سوانح میں ملتی ہے۔ ایک دن ایک رئیس زادہ ہندسہ سیکھنے کے لئے اقلیدس کے پاس آیا۔ اقلیدس نے اُسے ہندسے کی پہلی شکل سکھائی۔ رئیس زادہ کہنے لگا "اس کے سیکھنے کا عملی فائدہ کیا ہوگا؟"

اقلیدس نے غلام کو آواز دی : "گردمیو ! ان صاحبزادے کو ایک اشرفی دے کر رخصت کردو۔"

مرد شروع سے عورت پر طنز کرتا آیا ہے۔ والٹیر کہتا ہے :

عورت صرف ایک راز محفوظ رکھ سکتی ہے ـــــ اپنی عمر کا راز ::

ایک عورت نے مرد پر جو طنز کیا ہے وہ حاضر جوابی یا Repartee کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔ مشہور ہسپانوی رقاصہ کیرولین اوٹیرے سے کسی شخص نے طنزاً کہا :

"عورتیں اتنی حسین ہو کر اس قدر احمق کیوں ہوتی ہیں؟"

رقاصہ نے برجستہ کہا :

"قدرت عورت کو حُسن اس لئے دیتی ہے کہ مرد اس سے محبت کرے اور حماقت اس لئے کہ وہ مرد سے محبت کر سکے۔"

حاضر جوابی کی ایک عمدہ مثال مجدالدین کی "خارستان" میں ہے۔

"مولانا قطب الدین نے ایک احول (بھینگا) سے پوچھا : "کیا یہ صحیح ہے کہ بھینگے کو ایک کے دو دکھائی دیتے ہیں ؟" کہا "صحیح ہے کیونکہ میں مولانا کو چہار پایہ دیکھ رہا ہوں۔"

مزاح کے نہایت شگفتہ نمونے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے سوانح میں ملتے ہیں مرزا اس قدر ظریف الطبع تھے کہ اپنے آپ پر بلکہ موت پر بھی چوٹیں کر جاتے تھے۔ ان کے لطائف مشہور ہیں۔

"تاریخِ یونان سے مزاح کی ایک مثال درج ذیل ہے۔
ایتھنز کے تھیٹر میں کوئی تمثیل کھیلی جاتی تو تماشائی اس کے دوران میں کھانا کھاتے شراب پیتے اور خشک مغزیات ٹھونگتے رہتے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کسی تمثیل کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ دیا جاتا تھا کہ اس کی نمائش کے دوران میں خشک مغزیات کے بڑے بڑے ڈھیر دیکھنے میں آتے تھے۔ بعض تماشائی اکتا کر یا ناراض ہو کر سٹیج پر پتھر پھینکتے تھے۔
ایک موسیقار نے کسی شخص سے اپنے مکان کی تعمیر کے لئے کچھ پتھر ادھار لے رکھے تھے۔ ایک دن اس نے پتھروں کی واپسی کا تقاضا کیا تو موسیقار بولا۔ "اطمینان رکھو میرا ارادہ عنقریب تھیٹر میں گانے کا ہے۔ جو پتھر تماشائی مجھ پر پھینکیں گے اُن سے تمہارا قرض چکا دوں گا۔"

مزاح کی ایک قسم وہ ہے جسے Pantagruelism[۵۵] کہا جاتا ہے اور جو مشہور فرانسیسی قصہ نویس رابیلے سے منسوب ہے۔ رابیلے نے نشاۃ الثانیہ کا زمانہ پایا تھا وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے دلسوزی اور ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے اور ان کی شیخی خوری اور ریاکاری کا خاکہ اس انداز میں اڑاتا ہے کہ ان کی کمزوریوں سے نفرت ہونے کی بجائے آدمی اُلٹا ان سے پیار کرنے لگتا ہے۔ لیکن رابیلے بعض اوقات پھکڑ بھی بولنے لگتا ہے۔ رابیلے اور اس کے بعد مولیئر اور والٹیر نے پادریوں کی دُکان آرائی اور گندم نما جو فروشی کو خاص طور سے تمسخر و تضحیک کا نشانہ بنایا۔ والٹیر کا عقیدہ تھا کہ نیکی ظاہری مذہبی رسوم عبادت کی پابندی کا نام نہیں ہے بلکہ ہمدردیِ انسان میں ہے۔ والٹیر کی ایک کہانی ہے "بابا بیگ" جس میں ادمی برہمن سے پوچھتا ہے:

---

۵۵ رابیلے کا قصہ ہے۔ Gargantua and Pantagruel-

کیا یہ ممکن ہے کہ میں انیسویں بہشت تک پہنچ جاؤں؟

برہمن نے کہا: "اس کا انحصار تو اس بات پر ہے کہ تم کس قسم کی زندگی گذارتے ہو۔"

"میں ایک اچھا شہری ہوں، ایک اچھا شوہر، ایک اچھا باپ اور اچھا دوست بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں اُمراء کو بلا سود قرض بھی دے دیتا ہوں۔ غریبوں کی امداد بھی کرتا ہوں اور پڑوسیوں میں امن قائم کرتا ہوں۔"

برہمن کہنے لگا۔ "لیکن کیا تم کبھی کبھار تپسیا میں ننگے بدن کیلوں کے بستر پر بھی لیٹتے ہو؟"

"نہیں مقدس باپ۔"

برہمن نے کہا: "افسوس کہ تم انیسویں بہشت تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔"

مزاح کی ایک قسم خالصتاً دیہاتی ہے جسے انگریزی میں Rustic Humour کہا جاتا ہے۔ اس مزاح پر نام نہاد "مہذب" اشخاص ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن اس مزاح کی تہ میں عمیق مشاہدہ مخفی ہوتا ہے اور اس میں انسانی فطرت کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کے بعض الفاظ و تراکیب ایسے معنی خیز ہیں کہ ایک ایک لفظ طنز و مزاح کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ پنجابیوں کی روایتی زندہ دلی ان کی بول چال میں پوری طرح منعکس ہوئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنجابی زبان کی شگفتگی نے انھیں زندہ دلی کی دولت سے مالا مال کیا ہو۔ وارث شاہ دیس پنجاب کے شاعر ہیں اس لئے ان کا مزاح اساسی طور پر دیہاتی ہے جس سے وہی اشخاص بحسن وجوہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جن کا رشتہ کسی نہ کسی صورت میں دیہات کی بھوری مٹی سے قائم ہے۔ ان کے یہاں حاضر جوابی کے بھی شگفتہ نمونے ملتے ہیں۔ وارث شاہ کے مزاح کا ایک لطیف نمونہ مجھی نائن کی وہ طویل تقریر ہے جس میں وہ مختلف دیہاتی اقوام کے عشق کا ذکر ان کے مخصوص پیشوں کے حوالے سے کرتی ہے کہتی ہے کہ کھتری کا عشق پوری کی طرح خستہ ہوتا ہے اور برہمنی کا عشق کھیر کی طرح شیریں۔ ع

ع لچی وانگ سی عشق کھترانیاں دا عشق بھمنی دا کھنڈ کھیر دائی

یاد رہے کہ کھترانیاں نہایت لذیذ پوریاں تلتی ہیں اور برہمنوں کے گھر کی کھیر خاص طور سے بڑی خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

دھوبن کا عشق طباشیر کی طرح اُجلا اور بے داغ ہوتا ہے۔

ع چڑھیا کھنب تے عشق سی دھوبیاں دا چٹا رنگ جیویں طباشیر دائی

سپاہی کی زوجہ کا عشق کونج کی طرح فریاد کرتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے پردیسی شوہر کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔

ع کونج وانگ سپاہن دا کوک دا ای نکلے راہ نت کونت سفیر دائی

سپاہیوں کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں اکثر گھر سے دور رہنا پڑتا ہے ان کی محبوبائیں جدائی کی آگ میں سلگتی رہتی ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ کی ایک کافی کا پہلا مصرع ہے۔

ع ڈھول وے سپاہیڑا آوس ماندڑے کول

مغنّی نائن کہتی ہے کہ شہری عورتوں کا عشق جیٹھڑین کا ہوتا ہے کہ ہر وقت اپنے چاہنے والوں سے مٹھائی کی فرمائش کرتی رہتی ہیں اور دیہاتنوں کا عشق بے بسی کا ہوتا ہے اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور کریر کے درخت کی طرح بے ثمر ہوتا ہے۔

چسکے خور ہے شہرناں تہرناں دا کھائے مول نہ نان فطیر دائی

عاجز عشق رناں پنڈ والیاں دا بے قدر جیوں رکھ کریر دائی

ککّے زائنوں سے عشق کرنا عمر بھر کا جھگڑا مول لینا ہے۔

ع ککّے زائناں دا عشق عمر ساری کرے جنگ بیکار تدبیر دائی

کشمیری عورتوں کا عشق بے کیف اور سرد مہری پر مبنی ہوتا ہے۔

ع سرد عشق ہے خوب کشمیرناں دا ٹھنڈا طبق جیوں زمہریر دائی

خاکروبہ کا عشق سہل ہوتا ہے۔ جیسے لمبی گھاس درانتی سے آسانی سے کاٹی جاتی ہے۔

اور خوجوں کا عشق ڈھنگا پڑتا ہے کہ نت نئی فرمائشیں کرتی رہتی ہیں۔

ع عشق داڑی واڈھواں چوہڑیاں دا عشق خوجیاں دا مال اٹیر دائی

نائن کا عشق اُسترے کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا ہے اور مُلانیوں کا عشق تکبیر پڑھنے تک محدود ہوتا ہے۔

ع عشق اُسترے وانگ ہے نائناں دا مُلوانیاں یا تکبیر دائی

ترکھانیوں کا عشق ایسا محکم ہوتا ہے جیسے کیلا ٹھونک دیا جائے۔ اور لوہاری کا عشق لوہے کے کڑے اور زنجیر کی طرح جکڑ لیتا ہے۔

ع کلّے ٹھوکواں عشق ترکھانیاں دا اُتے لوہاریاں کڑا زنجیر دائی

خدا رنڈی کے عشق سے بچائے کہ وہ ایسی تصویر ہوتی ہے جس میں صرف ظاہری رنگ روغن ہی ہوتا ہے۔

ع میتھے رنج لگے عشق خانگی دے ظاہر روپ اس نقش تصویر دائی

وارث شاہ کے مزاح کی ایک لطیف مثال ہیر کے علاج سے متعلق ہے۔ جب ہیر نے مکر کیا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے تو کھیڑے رانجھے جوگی کو اس کے علاج کے لئے بلا لائے۔ وارث شاہ کہتے ہیں۔

ان بے شعور کھیڑوں کی حماقت تو دیکھو کہ خود باز کے پنجے میں طعمہ دے دیا ہے۔

بھوکے کو کھیر کا رکھوالا مقرر کیا ہے اور رنڈوے سے کہا ہے کہ ہمارے لئے رشتہ تلاش کرو۔

بندر کو پھلیوں کے قریب بٹھا دیا ہے اور سرسوں کے دانے کیڑے مکوڑوں کے آگے بکھیر دیئے ہیں۔

مرغوں کے سامنے اناج دھوپ میں ڈال دیا ہے۔

گیدڑ کو خربوزوں کے کھیت کا چوکیدار بنایا ہے اور کاغذ کی ناؤ بندر کے سپرد کی ہے کہ جاؤ اس میں لوگوں کو دریا کے پار لے جاؤ۔ اونٹ سے باغ لگوا رہے ہیں۔

بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھیڑیئے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور شیر سے کہا ہے کہ جاؤ ہماری

بھینسیں چرا لاؤ۔

زر و مال کی حفاظت ڈاکو کے سپرد کی ہے اور خود چور سے کہتے ہیں کہ چوری کا سراغ لگاؤ۔

گدھے کو جَو کے ڈھیر کا نگران مقرر کیا ہے۔ اور اندھے سے کہا ہے جاؤ لکھ لاؤ۔

سانپ کاٹے کا منتر پڑھنے کے لئے جوگی کو لے آئے یہ نہ سوچا کہ یہ تو اُلٹا ہیر کو سانپ سے ڈسوا دے گا۔

بھسکو شاہ نے ڈیرہ لگا دیا اور اغوا کی تدبیر کرنے لگا۔

جوگی مدت سے کھیڑوں کے دوارے پر آگ سُلگائے بیٹھا تھا آج اسے بھیک دی گئی۔

دیکھو عقل شعور جو ماریا نے طعمہ باز دے ہتھ بٹیرا دتے نوں
بگلا کھنڈتے کھیر دا پیار اکھا رنڈا گھلیا ساک کرادتے نوں
آکھن ویشنو دیوی دا ورت رکھو باندر پھلیاں کول بٹھا دتے نوں
مرسوں کول کوڑیاں رکھیو نے دانے ککڑاں پاس سکھا دتے نوں
گدڑ کچریاں تے جمعدار کیتا اُٹھ چلیا باغ بھی لا دتے نوں
بیڑی کاغذ دی باندراں سونپیو نے اوہناں گھلیا پُور لنگھا دتے نوں
اُجڑ اُگے بھگیاڑ دے چھیڑ دتا شیر چلیا میں چرا دتے نوں
راکھا مال دا دھاڑوی رکھیو نے چور سدیا کھوج لگا دتے نوں
راکھا جوّاں دے ڈھیر دا گدھا ہویا اَنھا گھلیا حرف لکھا دتے نوں
اوہناں سپ دا ماندری سدّ آندا سگوں آپ ہی سپ لڑا دتے نوں
بھسکو شاہ ہوری اج آ بیٹھے تنبو آن ادھا لواں لایا ئی
دھوواں مار بیٹھا جوگی مدتاں دا اج کھیڑیاں خیر گھتایا ئی

گدڑ کچریاں دا راکھا؛ "پھلیاں دا راکھا باندر" ہمارے دیہات میں ضرب المثل بن چکے ہیں۔

بعض ناقدین نے مزاح کی دو قسمیں گنائی ہیں۔ (۱) کردار کا مزاح (۲) صورت احوال کا

کا مزاج ۔ مولیئر کو صورتِ احوال کے مزاج کا استاد مانا گیا ہے۔ مندرجہ بالا مثال صورتِ احوال کے مزاج کا ایک دلآویز نمونہ ہے۔ اِس صورت احوال میں فرحیہ اور المیہ آپس میں اس طرح گھُل مل گئے ہیں جیسے کالی گھٹا میں ابرِ گریہ کُناں اور برقِ خندہ زناں مجتمع ہوتے ہیں۔ یوں تو ساری تمثیلیں بڑی دلچسپ ہیں لیکن یہ کہنا کہ رنڈوے کو کسی کا رشتہ تلاش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے خاص طور سے مزیدار ہے۔ ظاہر ہے کہ رنڈوا کسی کے رشتے کی تلاش میں جس گھر جائے گا پہلے اپنے آپ کو رشتے کے لئے پیش کرے گا۔ کھسکو شاہ کا نام بھی بڑا معنی خیز ہے اس کا مطلب ہے اغوا کرنے والا۔ محض کھسکو شاہ کہنے سے اغوا کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اِس صورتِ احوال کا فرحیہ تو ظاہر ہے۔ مندرجہ بالا تمثیلوں سے پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ لیکن کھیڑوں کی سادہ لوحی اور رانجھے اور ہیر کے عزائم سے ان کی بے خبری نے اس میں المیہ کا عنصر پیدا کر دیا ہے۔

رانجھا جوگی بن کر رنگ پور آیا تھا۔ اس کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے وارث شاہ کہتے ہیں ؎

جیویں چھُٹ قلندروں ریچھ بھیردا اکے پھرے سنڈا لمبی بیل دائی
باغ وچ ایہ کھیڑیاں آن وڑیا بوٹا ڈھونڈ دا پھُل رویل دائی

کہتے ہیں کہ رانجھا اس طرح آیا جیسے کوئی ریچھ قلندروں سے رہائی پا کر بھاگ نکلا ہو۔ وہ بھینسا ہے جو کھیڑوں کے باغ میں گھس آیا ہے اور رویل کے پھول (ہیر) کا پودا تلاش کر رہا ہے۔ یہ کردار کے مزاج کی عمدہ مثال ہے۔

وارث شاہ کے مزاج کا ایک دلکش نمونہ بالناتھ جوگی اور رانجھے کے مکالمے میں ملتا ہے۔ بالناتھ نے جوگ دینے کے بعد رانجھے سے کہا کہ اب عورتوں کے قریب نہ پھٹکنا۔ اور عورتوں میں اس طرح رہنا جیسے ایک خصّی بیل گایوں میں رہتا ہے۔ کسی چھوکرے یا چھوکری سے آنکھیں نہ لڑانا راستے میں کسی موٹی تازی عورت سے مڈبھیڑ ہو جائے تو منہ دوسری طرف پھیر لینا۔ رانجھا بولا ناتھ جی آپ کی یہ نصیحت تو مجھے پسند نہیں۔ میں بڑھیا کو تو اپنی ماں ہی سمجھوں گا لیکن موٹی تازی جوان عورت

سے بے تعلق رہنا تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ؎

جوگی

پاسے جوگ دے تے کھیڈن جا بازی چلیں سمجھ کے چال اس گوڑی نوں

کھسی بلدوانگوں گاہاں وِچ پھرنا نہیں گھتنا دہڑتے جھوٹڑی نوں

جتی ستی نانیاں ہو ٹیکے تے رکھیں خوب مضبوط لنگوٹڑی نوں

جیکر ساہمنے آوے تاں مونہہ پھیریں کدی ویکھنا ناں رن موٹڑی نوں

رانجھا

تیری پید پسند نہ اساں نا تھا رکھ اندرے ہی بھاری تھوکڑی نوں

تیری منت دی اساں نہ لوڑ کائی کا نہوں اگریں پیا بھٹوکڑی نوں

اساں بڈھی نوں ماں ای جاننا ای رن جاننا ای چھوٹی جھوکڑی نوں

جتھے نظر آوے کوئی رن موٹی نائیں چھڈناں کلیاں ٹھوکڑی نوں

اُردو میں ان اشعار کے بے پناہ مزاح کو منتقل کرنا ممکن نہیں ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ تہ در تہ معانی وابستہ ہیں۔ یہ دیہاتی مزاح (Rustic Humour) کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ایک البیلے جاٹ نوجوان سے اسی نوع کے جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔ جوگ بھی اس کی زندہ دلی اور ذوقِ حسن کے کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

وارث شاہ کی ظرافت بسا اوقات ایسے تمسخر آمیز الفاظ و تراکیب پر منحصر ہوتی ہے جن کا مجرد استعمال ہی مزاح کی شگفتگی یا طنز کی تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً سہتی ہیر سے کہتی ہے ؎

تیرے طور دُتن بھابی راز ایہا جھوٹی عمر تے دُکھڑے پئے وَڈّے

کوئی چاہ نہ دُہٹیاں وانگ تینوں بہی پلنگ تے گھرکدی رہیں جیڈّے

"گھرکدی رہیں جیڈّے" میں طنز کا ایک جہان آباد ہے۔

لُڈّن ملاح سیاہ فام تھا۔ ہیر ناراض ہو کر اس سے کہتی ہے ؎

وِس لُڈّناں کالیا گڈّھناں دے کیسے اساں دا پلنگ خراب کیتا

ہیر دی سیج تے کون سو گیا جے ہیر کُٹھ تُرو ب ہو رب کیتا

"لُڈناں کا لیا گُڈھناں" میں بیان کی لطافت بھی ہے اور طنز کی زہرناکی بھی۔
ہیر اپنے پلنگ پر سوئے ہوئے رانجھے کو مارنے کے لئے آگے بڑھتی ہے تو گرج کر کہتی ہے ؎

راتیں کدے اُنیندڑا کھیوی کھا کے گھُوک سُوتوں ٹُک بیہا ہیں وے
تُنجی دیکھ تخھمڑی سیج میری چمڑیوں توں ہو ٹیکے لیہا ہیں وے

"لیہا" وہ کیڑا ہوتا ہے جو گرم کپڑوں کو چاٹ لیتا ہے۔ کہتی ہے کہ تو لیہا بن کر میری سیج سے چمٹ گیا ہے۔ شاید تو نے باسی روٹی کھائی ہے "ٹُک بیہا" اور "لیہا" کے الفاظ نے بھرپور طنز کا سماں پیدا کر دیا ہے۔

اس نوع کے طنزیہ اور مزاحیہ شعر ہیر وارث شاہ میں اس طرح بکھرے پڑے ہیں جیسے گھنے سبزہ زار میں جا بجا پھول اُگ آئے ہوں۔ لیکن وارث شاہ کی طنزیہ شاعری کا شہپارہ سہتی اور جوگی کا مکالمہ ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند اقتباسات ہی پیش کر سکیں گے۔ رانجھا جوگی بن کر بھیک مانگنے کے لئے سیدے کھیڑے کے گھر جا پہنچا۔ رانجھے اور ہیر کی آنکھیں چار ہوئیں تو سہتی تاڑ گئی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس نے جوگی کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ تو جوان جہان موٹا مسٹنڈا ہے محنت کر کے روٹی نہیں کماتا اور مفت خورہ بن کر گھر گھر پھرتا ہے۔ یہ کہہ اُس نے جوگی کا کاسۂ گدائی توڑ ڈالا۔ اس پر جوگی جز بز ہوا، اور دونوں میں تکرار شروع ہو گئی۔ جیسا کہ رانجھے اور بھابیوں کی تکرار سے مفہوم ہوتا ہے۔ وہ بھی طنزیہ نوک جھونک سے بے بہرہ نہیں تھا۔ اور شوخ اور چنچل سہتی تو شیطان کی خالہ تھی۔

سہتی رانجھے سے کہتی ہے ؎

اسیں بھُوت دی عقل گوا دیئے سانوں لا کھبُوت ڈرا دا نا ہیں
جمع سوہنیاں نڈھیاں ہون جتھے اوتھے جھاتیاں پیا دگا نا ہیں

کہتی ہے ہم عورتیں تو بھوت کو بھی تگنی کا ناچ نچا دیتی ہیں تو ہمیں بھبُوت مل کر ڈراتا ہے۔

بھوت کے ساتھ بھبوُت کا استعمال حسنِ بیان کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ پھر کہتی ہے کہ جہاں کہیں تُو جوان لڑکیاں دیکھتا ہے وہیں تاک جھانک شروع کر دیتا ہے۔

گ۔ بُچکے خور بُوہے بُوہے پھریں بھوندا پھپّھے کٹنیاں جویں کُرماسیاں دیاں

ہمارے دیہات میں پھپّھے کٹنی مکّار اور عیار عورت کو کہتے ہیں۔ بھپھ کا معنیٰ ہے پُرانی رُوئی اِس سے ایک لطیفہ وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے ہاں کوئی مہمان آکر ٹھہرا۔ کئی دن گذر گئے لیکن مہمان جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر میزبان اور اس کی عورت نے اسے بھگانے کا منصوبہ بنایا۔ میزبان کی عورت اندر کی کوٹھڑی میں جاکر لکڑی سے پُرانی روئی کو کوٹنے لگی۔ اور گالیاں بکنے لگی۔ مہمان نے یہ شور و غوغا سُنا تو میزبان سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بولا ۔میری عورت بڑی غصیلی ہے۔ بچّوں کو پیٹ رہی ہے۔ یہ سُن کر مہمان متوحش ہو کر بھاگ گیا۔ مکّار عورتیں رشتے کرانے کے لئے بڑے جیلے اور جتن کرتی ہیں۔ سہتی کہتی ہے کہ تو بھی مکّار عورتوں کی طرح گھر گھر چکر لگاتا پھرتا ہے۔

سہتی ۔ کھنڈ کھیر ملائی دی خبر کیتھوں بھیڑے بُھکھیاں چول ابالواں نوں
جانن سار کی کھنڈ دے لڈواں دی جہڑے کھان ابال کے آلواں نوں

رانجھے سے کہتی ہے کہ تیرے جیسے بھک منگے جو اُبلے ہوئے چاول کھاتے ہیں کھیر کی لذّت کیا جانیں اور آلو کھانے والے لڈوؤں کا ذائقہ کیا جانیں۔

سہتی ۔ بھیڈاں وچ توں اُوٹھ پچھانائیں پرکھ بلیا ئیں کھنڈ بتیں بالواں نوں
جھوٹھا آہندیاں شرم نہ آوندائی چوراں یاراں تے ٹھگ اُدھالواں نوں

رانجھے سے کہتی ہے کہ تو نرا احمق ہے۔ بھیڑوں اور اونٹوں یا کھانڈ اور ریت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ تو چوروں اور ٹھگوں اور اغوا کرنے والوں کی طرح جھوٹا بھی ہے۔ بھیڑوں میں کھڑا ہوا اونٹ دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں جب کسی کو احمق کہنا ہو تو کہتے ہیں واہ! تم تو بھیڑوں میں اونٹ پہچان لیتے ہو۔

سہتی ۔ گھر بار توں مار کے چک دیئے تیرے در گیاں جھگڑا گالواں نوں

شکل بھوتنے دی دعویٰ یوسفی دا ذرا دیکھنا نور جمالوں نوں

کہتی ہے۔ شکل تو تمہاری بھتنے جیسی ہے اور اپنے آپ کو یوسفِ ثانی سمجھتے ہو۔ ذرا دیکھنا تو اس "نورِ جمال" کو۔

سہتی۔ ع بو بکرے دے وانگ بو کدائی مینوں اس جاتا کوئی پٹھ ہے نی

بو بکرا وہ بکرا ہوتا ہے جو مستی میں آکر "بو بو" کی آواز نکالتا ہے اور بکریوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ پٹھ جوان بکری کو کہتے ہیں۔ کہتی ہے یہ جوگی تو مستی میں آیا ہوا بکرا ہے۔ کیا اس نے مجھے کوئی پٹھ سمجھ لیا ہے کہ مجھے دیکھ کر "بو بو" کرنے لگا ہے۔

سہتی۔ ع خشکی بھنگ بھنیں سنگھ بھرڑا ونا ائی اہدی وچ کلام نہ مٹھ ہے نی

بھنگ پینے سے گلا خشک ہو جاتا ہے اور آواز ٹھیک سے نہیں نکلتی "بھرڑا وناں" صوتی لفظ ہے جب آواز گلے سے پوری نہ نکل رہی ہو تو "بھرڑا" جاتی ہے۔ اسی لفظ نے طنز پیدا کی ہے۔ رانجھا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ سہتی طنزیہ انداز میں کہتی ہے۔ ؎

لوتھڑا بوتھڑا سن سنیا دے کسے سنج مکان دیا جندیا دے
اوہجڑا بو ہجڑا کھنڈیا گنڈیا دے سدھی آری دیا ونگیا دندیا دے

لوتھڑ بوتھڑ اوہجڑ بو ہجڑ بیڈول اور بیڈھب جسم والے موٹے آدمی کو مذاقاً کہتے ہیں کہتی ہے کہ تیری ماں نے تجھے ویرانے میں جنا ہے۔ لکڑی چیرنے والی آری کے دندانے بڑی احتیاط سے سیدھے رکھے جاتے ہیں۔ ایک دندانہ بھی ٹیڑھا ہو تو لکڑی چیری نہیں جا سکتی۔ سہتی کہتی ہے کہ تو سیدھی آری کا ٹیڑھا دندانہ ہے۔ یعنی اُلٹی کھوپڑی ہے

سہتی ؎ مونھوں اوت گھتوتیاں واہ تاہیں ذرا ٹھاک زبان نوں گندیا دے
رناں وچ دھتاں کمیا پیسر بیٹھوں جھوٹے وانگ وچ بھیں دے کھندیا دے

اوت گھتوتیاں انمل بے جوڑ ہرزہ سرائی کو کہتے ہیں۔ دھتاں مارنا یا پیسر بیٹھنا سے مراد ہے دھرنا مار کر بیٹھنا۔ کہتی ہے جیسے جوان بھینسا بھینسوں میں گھس کر بیٹھتا ہے اسی طرح تو

عورتوں میں دھڑنا مار کر بیٹھا ہے۔ ہندی میں کہیں گے گوپیوں میں کاہن بنا بیٹھا ہے۔

لا یو دیس مداریاں ہو گیاں دا سروں کونیاں تے وچوں کھوٹیا دے

دھرکونیا کون منوتیا وے بھوندے چاک توں لتھیا لوٹیا دے

کونا کون منونا ایسے آدمی کو کہتے ہیں جس کے سر پر اُسترا پھروا دیا گیا ہو جیسے کہ رانجھے جوگی کا سر تھا۔ دھرکونا دھریک (بکائن) کا پھل ہوتا ہے۔ مُنڈے ہوئے سر کو دھرکونا کہنا نہایت موزوں ہے کہتی ہے تو نے جوگیوں کا بھیس بدل رکھا ہے اور سر منڈا رکھا ہے لیکن تیرا اندرون کھوٹا ہے تو اس کوزے کی طرح بے ڈول ہے جسے چکر کھاتے ہوئے چاک سے کمہار نے قبل از وقت اتار لیا ہو۔

سہتی ۔ لٹھ وانگ ایہ جیٹھ ہے گول گیا گھڑیا کہناں انجان ترکھانیاں نے

تُل مُرل واگوں نک منہ وتوں چھلے ولیب اصاف کھترانیاں نے

کہتی ہے تو لٹھ کے مانند اَن گھڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے تجھے کسی اناڑی بڑھئی نے تراشا ہے۔

تُل مُرل بے ڈول جسم والے آدمی کو کہتے ہیں۔ سہتی کہتی ہے تیری شکل و صورت سے یوں لگتا ہے جیسے کھترانیوں نے تجھے چھلکے بیلن سے بیلا ہے اور ناک منہ درست نہیں کیا۔

سہتی ۔ اصل فقیر سوئی جنہے مرشداں نے گھت وچ کُٹھالیاں گالڑے دے

ایویں کھڑکدا پھڑکدا پھریں بھوندا ہنکن اسپ جیوں کسی رسالڑے دے

کہتی ہے حقیقی فقیر تو وہ ہوتے ہیں جو ریاضت کی آگ میں تپ کر نکلے ہوں تو ایسے بنکارتا پھرتا ہے جیسے رسالے کے گھوڑے ہنہناتے ہیں۔

سہتی ۔ رکھنوں پچن اُنہاں مسٹنڈیاں نوں جنہاں کھادیاں دُودھ ملایاں نے

کہتی ہے تیرے جیسے مسٹنڈوں کو دودھ بالائی ہضم نہیں ہوتے یعنی وہ خرمستی کرنے لگتے ہیں

سہتی ۔ اگے کناں نوں لیک لوایا ئی ہن نک توں لیک لگاوں گی ٹے

کہتی ہے کہ تو نے کان تو پہلے ہی پھڑوا دیے ہیں۔ ناک رہ گئی تھی سو میں کاٹ لوں گی۔

سہتی ۔ فرفیجیا ٹھکریا ٹھکریا دے ایس پنتھ دا بھید نہ آیو دے

منگ کھان دے واسطے ساد بنیوں بدن خاک دے وچ رلا یو دے

فریفتہ۔ مکّرا ٹھکرا فریبی کو کہتے ہیں۔ سہتی کہتی ہے تُو جوگ کا راز نہیں پا سکا۔ بھبھوت مل کر جوگی بن بیٹھا ہے۔ اس سے تیرا اصل مدعا مفت کی روٹیاں توڑنا ہے۔

سہتی بڑی بے باک اور لڑاکا تھی۔ رانجھے کو دھمکاتے ہوئے کہتی ہے۔ ؎

جدوں موہلیاں پھڑکے گرد ہوئے پھٹتے کڈھیئے چھنیاں کوٹیاں دے
جُٹ جُٹ کے کُٹیئے نال سوٹے ایہ علاج نے چُتڑاں موٹیاں دے

کہتی ہے کہ تیرے جیسے موٹے چوتڑ والوں کا علاج یہ ہے کہ تمہیں رسّی سے جکڑ کر تمہاری خوب دھنائی کی جائے اور موہلیوں سے تمہارا ایسا بھرکس نکالا جائے جیسے چھینے کو کوٹ کر اس کا مغز نکالتے ہیں۔[1]

رانجھے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور "جواب آں غزل" میں ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کیں کہ سہتی ایسی بے لگام کو بھی قدرِ عافیت معلوم ہو گئی ہو گی۔ جب سہتی نے بھیک دینے میں تامل کیا تو رانجھا بولا ؎

پاویں خیر نہ فقراں عاجزاں نوں گنیں انگلاں وانگ اروڑیاں دے
دولتمند ہو کے گنیں ٹکیاں نوں کھاویں ہانڈیوں کھرچ گھروڑیاں دے

اروڑا ہندو بنیوں کی ایک گوت ہے یہ لوگ نہایت خسیس ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تجھ سے بھیک مانگی جاتی ہے تو اروڑیوں کی طرح انگلیوں پر حساب کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ٹکّے گننے لگتی ہے اور ہنڈیا کی کھرچن تک نہیں چھوڑتی۔

رانجھا ؎ نہیں کھتریاں دی نسل ایہ ندھی کتھاں گگڑیاں دی جانے گوتری اے
دمڑی دمڑی دا کرے حساب دم دم روڑی قوم دی گوت ٹھوتری اے
دھوکے نال ایہ عاجزاں لُٹدی اے کھاندی سُود بیاج بڑھوتری اے
ایویں لڑے فقیراں دے نال ندھی اڑک جویں ہلیں نہ جوتری اے

[1] منگ دھمال کھیلتے ہیں تو بار بار نعرہ لگاتے ہیں: اوچھیاں اوچ چھڑیندا اوموہلا اوچ مریندا

اساں اینتی گل معلوم کیتی موٹی گھونٹنی بھنگ سلوتری اے

لسّی پی کھٹّی رتیے مول ناہیں وگّے ہتھیوں الیسدی لوتری اے

بڑبڑ کرے بکواس لے جوگیاں نوں جٹیّ نہیں اصیل ایہ لوتری اے

وارث شاہ میاں نال رنبیاں دے کتّے گوڈکے تے ناہیں کھوتری اے

کہتا ہے کہ یہ لڑکی کھیڑوں کی نسل سے معلوم نہیں ہوتی۔ لگتا ہے جیسے گگڑی (ایک خانہ بدوش قوم) ہے۔ اور اروڑے بنیوں کی گوت ملوتروں سے تعلق رکھتی ہے اور انہی کی طرح بیاج کھاتی ہے۔ فقیروں سے اس طرح لڑتی ہے جیسے کہ اڑیل بھینس ہو جسے ہل میں نہ جوتا گیا ہو۔ سنڈھ پنجابی میں وہ بھینس ہوتی ہے جو بچہ نہ جنے۔ اسے جاٹ ہل میں جوتتے ہیں۔ سہتی بھی موٹی تازی عورت تھی۔ رانجھا کہتا ہے کہ یہ تو بھنگ گھوٹنے والے ڈنڈے کی طرح موٹی ہے۔ ہر وقت کھٹّی لسّی پیتی رہتی ہے اور موتتی رہتی ہے۔ جوگیوں کے سامنے بک بک کرتی ہے۔ شاید اس کا پالا کسی مرد سے نہیں پڑا جو اس کا دماغ درست کر دیتا۔

رانجھا ؏ ایہ خصم نوں کھان نوں کویں دیسی جٹڑی خیر دیندی پئی جھرکدی اے

کہتا ہے یہ فقیروں کو بھیک تک نہیں دیتی شادی کے بعد اپنے شوہر کو بھی بھوکا رکھے گی۔

رانجھا ؏ شکار وچ دریا دے کھیڈ موئیے کیہیاں موت وچ مچھیاں جاہتی ایں

" موت وچ مچھیلیاں پھڑنا " پنجابی کا محاورہ ہے جو کسی شخص کی کم ظرفی اور کمینگی پر بولا جاتا ہے سہتی گول مٹول گدبدی عورت تھی اس کی فربہی پر طنز کرتے ہوئے رانجھا کہتا ہے

؏ سارا گول بے ڈول ہے جسم تیرا پنڈ بنھ رکھی جویں مرک دی اے

مرک ایک نرم گھاس ہے۔ کہتا ہے تیرا جسم ایسا بے ڈول ہے جیسے مرک کا گٹھا۔

سہتی نے زبانی طعنوں مہنوں پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اچھل اچھل کر اسے ٹھینگا دکھایا تھا۔ رانجھا کہتا ہے ؎

حسن متیئے بوکے سون چڑیئے نیناں والیئے شوخ ممولیئے نی

اک وار کیتی گل ہو چکی بار بار نہ سیئے پڑ چو لیئے نی

رنگ گورڑے نال توں جگ مُٹھا وچوں گُناں دے کارنے پولئے نی
وہڑے وِچ توں کنجری وانگ نچیں چوراں یاراں دے وِچ دہ چولئے نی

کہتا ہے کہ تجھے اپنے جوبن پر بڑا ناز ہے تو اپنے آپ کو سنہری چڑیا سمجھتی ہے اور مولے کی طرح پھدکتی پھرتی ہے۔ لوگ تیرے گورے رنگ پر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تو تجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے صحن میں کھڑی رنڈیوں کی طرح ناچ رہی ہے۔ تیرا کام چوروں یاروں کی امداد کرنا ہے۔ جب سہتی نے اس کا ناک میں دم کر دیا تو وہ زچ ہو کر بولا ؂

کھچے دھسکلے وڈی چنچال رنّے نال ماں کذات دے سیڑیئے نی
کرڑ کتیئے تے گھرڑ کھیئے نی نرڑ گنڈئیے انگ جھیڑیئے نی

یہ اس قدر ٹھیٹ اور فصیح پنجابی ہے کہ اس کا مفہوم کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اس سے صرف اہلِ زبان ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

ہیر وارث شاہ میں جا بجا طنز و مزاح کے نہایت شگفتہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ارسٹوفینس، جوینال، مولیئر، جریر وغیرہ نے بھی طنز و مزاح کے میدان میں گل بوٹے کھلائے ہیں لیکن سہتی اور رانجھے کی لطیف نوک جھونک اور طنز و جوابی طنز کا اس قدر طویل اور سیر حاصل مکالمہ دنیائے ادب میں کم از کم راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ ایک جید عالم اور بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ نہایت ظریف الطبع باغ و بہار آدمی بھی تھے۔

وارث شاہ کا سماجی شعور،

وارث شاہ کے سن پیدائش کے متعلق حتماً کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ "ہیر" کا سن تصنیف بقول ان کے ۱۱۸۰ھ ہے۔ ع

سن یاراں سو اسی سی نبی ہجری لمے دیس دے وچ تیار ہوئی

ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمانہ وارث شاہ کے بھرپور شباب کا تھا اور اپنی محبوبہ بھاگ بھری کی جدائی کا داغ ان کے سینے میں سُلگ رہا تھا۔

وارث شاہ نوں سِک دیدار دی سی جیہی ہیر نوں بھٹکنا یار دی سی

"ہیر" میں جا بجا عشق و محبت کے مضامین جس والہانہ از خود رفتگی سے نظم ہوتے ہیں اُس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ لکھتے وقت وارث شاہ کا جوش شباب اور جوش جنوں زوروں پر تھے۔

تاریخی لحاظ سے یہ وہ زمانہ ہے جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ اس زوال کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے ہوا۔ (۱۷۰۷ء) عالمگیر کے بیٹوں اعظم، معظم اور کام بخش میں تخت نشینی کی جنگوں نے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ جنگ کے دوران اعظم اور کام بخش مارے گئے۔ اور معظم بہادر شاہ کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لیکن ۱۷۱۲ء میں اسے موت نے آلیا۔ اس کے بیٹوں میں پھر لڑائیاں ہونے لگیں۔ جن میں جہاندار شاہ کامیاب ہوا۔ اور ۱۷۱۲ء

میں دلّی کے تخت پر بیٹھا۔ جہاندار شاہ عیش و عشرت کا رسیا تھا۔ ایک رنڈی لال کنور کا ایسا دیوانہ ہوا کہ نظم مملکت سے یکسر بیگانہ ہوگیا۔ راتوں کو شراب کے نشے میں دُھت دونوں گلیوں میں گھومتے پھرتے اور باؤلیوں میں مادر زاد برہنہ چھلانگیں لگایا کرتے۔ لال کنور کے قرابت دار ڈوم ڈھاڑی سرکار دربار میں دخیل ہو گئے۔ اور انھیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ سادات بارہہ حسین علی خاں اور عبداللہ خاں نے جہاندار شاہ کو قتل کر کے فرخ سیر کو تاجِ شاہی پہنایا (۱۷۱۳ء) دربار سازشوں کا مرکز بن گیا۔ ایک طرف تورانی سُنّی اور ایرانی شیعہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ دوسری طرف ہندوستان زا[1] اور ولایتی[2] ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کو بھی گرفتار کر کے جان سے مار دیا گیا اور سادات بارہہ نے رفیع الدرجات کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ ابھی جلد ہی راہیِ ملکِ عدم ہوا اور روشن اختر کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یہی روشن اختر تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے رُسوا ہوا۔ اس کے ایما پر نواب سعادت خاں نے سادات بارہہ کے اثر و رسوخ کا خاتمہ کیا۔ نظام الملک حیدرآباد کے سیر حاصل صوبے پر متصرف ہوگیا۔ ۱۷۳۰ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا۔ اس کی فاتحانہ یلغار، بے رحمانہ قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ نے سلطنتِ مغلیہ کو یکسر متزلزل کر دیا۔ اور دولتِ مغلیہ کی رہی سہی ساکھ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے صرف تیس برس بعد زوالِ دولتِ مغلیہ کا المیہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ وارث شاہ نے اسی پُر آشوب زمانے میں ہوش سنبھالا تھا۔ کہتے ہیں : ع نادر شاہ پنجاب فتور پائے میرے باب دے انہاں فتور کیتے،

ع نادر شاہ توں ہند پنجاب دھڑکے مرے باب دا تدھ بھونچال کیتو

لوگ نادر شاہ کی خونریزی اور تاخت و تاراج سے لرزاں و ترساں تھے اس کے حملے کو وارث شاہ نے بجا طور پر بھونچال سے تعبیر کیا ہے۔ اسی بھونچال نے مغلیہ جاہ و حشمت کے قصرِ رفیع کو زمیں

---

[1] وہ امرا جن کی پیدائش ہندوستان کی تھی ' ہندوستان زا ' کہلاتے تھے۔

[2] جو بیرونِ ملک سے ہندوستان میں وارد ہوتے۔

بوس کردیا۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں درباری امراء روسا رفسق و فجور کی دلدل میں غرق ہو گئے۔ کثرتِ شراب نوشی، افیم خوری اور کسبیوں کی صحبت نے ان کے قوائے عمل کو مختل کردیا اور وہ حوادثِ زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے جام و سبو اور کنارِ شاہد میں پناہیں ڈھونڈنے لگے۔ بابر کی اولوالعزمی، اکبر کی شہامت اور عالمگیر کی عزیمت و مباورت خواب و خیال ہوگئی۔ شاہی دربار اور امراء کے محلوں پر ڈوم، میراثی، سپردائی، ہیجڑے، امرد، ڈومنیاں، کنچنیاں، پاتریں چھا گئیں۔ محمد شاہ کو ۱۷۴۸ء میں موت نے ذلت و رسوائی کی زندگی سے نجات دلائی۔ اس کے بعد احمد شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے سلطنت کی باگ ڈور اپنی ماں کے رشتے دار بھانڈوں اور ہیجڑوں کے سپرد کی۔ ۱۷۵۴ء میں فوت ہوا۔ تو اس کا بیٹا عزیزالدین عالمگیر ثانی کے لقب سے اس کا جانشین ہوا اس زمانے میں ہر طرف مرہٹوں اور جاٹوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ ۱۷۵۹ء میں اسے قتل کردیا گیا۔ اور شاہجہان ثانی مسندنشین ہوا۔ اس کے عہد میں احمد شاہ ابدالی نے دلی پر چڑھائی کی اور پٹھان لشکریوں نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہزاروں مارے گئے اور سینکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ وہی شاہ عالم ہے جس کی آنکھیں بعد میں غلام قادر رُہیلہ نے نکلوا دی تھیں۔ انگریزوں نے شاہ عالم کی پنشن مقرر کردی اور امورِ سلطنت خود سنبھال لئے۔ مُغلیہ صولت و عظمت داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی۔ پچھلے پہر کی یہ چاندنی بھی ۱۸۵۷ء کے طوفان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُم ہوگئی۔

وارث شاہ کا سنِ وفات معلوم نہیں ہوسکا۔ قیاس غالب یہ ہے کہ انھوں نے کم و بیش ساٹھ برس کی عمر پائی تھی اور اس پُرآشوب زمانے کی افراتفری کو پنجاب میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ ظاہراً پنجاب کے مسلمانوں کی بربادی بھی وابستہ تھی وارث شاہ کے دیکھتے دیکھتے یہ صوبہ جس کے صدر حکومت لاہور کو اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب نے عالیشان عمارتوں سے سجایا تھا خونریز جنگوں کی لپیٹ میں آگیا۔ کہتے ہیں۔ ؎

احمد شاہ از غیب بھئیں آن پوسی جینڈیالہ او ستھیں رب بچا سیائی

سے　دنیا بیگ دے گرجیوں بپنے غلجے ڈیرہ لُٹ کے چا کنگال کیتو

احمد شاہ واگوں میرے دیر پچھے پٹ تھڈ کے چک ساتال کیتو

گے　سیاہ فام مہاراجیاں ہندیاں بھئیں لیسا راج افغان درانیاں نے

احمد خاں ایک پٹھان سردار تھا۔ جو نادر شاہ کے رسالے کا قائد تھا۔ جب نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو احمد خاں اپنے قبیلے سمیت اس کے لشکر میں شامل ہو گیا تھا۔ نادر شاہ لوٹ کھسوٹ کے مال سے لدا پھندا ایران لوٹ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ اور ہر ایک پر شک کرنے لگا۔ اسی حالت میں اس نے اپنے ہونہار اور حوصلہ مند بیٹے رضا قلی خاں کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔ اور کئی سرداروں کے سر قلم کروا دیئے۔ اس کی خونریزی سے تنگ آکر فوج کے کچھ سرداروں نے اسے جان سے مار دینے کا منصوبہ بنایا۔ احمد خاں ان کا سرغنہ تھا۔ ۱۷۴۷ء میں ایک رات یہ لوگ چپکے سے نادر شاہ کے خیمے میں گھس گئے اور اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ نادر شاہ کا خزانہ احمد خاں کی تحویل میں تھا۔ احمد خاں خزانہ لے کر افغانستان چلا آیا۔ یہاں نادر شاہ کا ایک سردار تار کی خاں ملتان، بھکر، پشاور وغیرہ کا خراج لے کر ایران جا رہا تھا۔ احمد خاں نے یہ خزانہ بھی اس سے چھین لیا۔ اور احمد شاہ ابدالی کے نام سے افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔ احمد شاہ کے مداح اور عقیدت مند اسے "دُرِ دوراں" (زمانے کا موتی) کہتے تھے۔ جس سے وہ دُرانی کے لقب سے مشہور ہوا۔ احمد شاہ ہندوستان کے حالات سے بخوبی واقف تھا اس نے ہندوستان اور پنجاب پر آٹھ حملے کئے۔ جب اس نے پہلی بار چڑھائی کی تو شاہنواز خاں لاہور کا صوبہ دار تھا۔ شاہنواز خاں نے احمد شاہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ احمد شاہ کی مراجعت کے بعد نواب معین الملک عرف میر منّو کو لاہور اور ملتان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ میر منّو نہایت دلیر حاذق و چوبند مردِ کار داں تھا۔ اس کے عہد میں جسّا سنگھ کلال نے خالصہ دَل کی بنیاد رکھی۔

• غلزئی کی پنجابی صورت۔ غلزئی پٹھانوں کا مشہور قبیلہ ہے۔ یہاں پٹھان مراد ہیں۔

اور سکھوں کی باقاعدہ فوجی تنظیم کی۔ میر منّو نے سکھوں کو سخت شکست دی اور انھیں تتر بتر کر دیا۔
وزیر صفدر جنگ میر منّو سے جلتا تھا۔ اُس نے شاہنواز خاں کو ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا لیکن میر منّو نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۲ء میں دوبارہ ہند پر فوج کشی کی۔ میر منّو نے لاہور کے قلعے میں محصور ہو کر مقابلہ کیا لیکن مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔ شاہ اس کی بہادری کا معترف تھا۔ اس نے جانی دشمن میر منّو کو اپنی جانب سے لاہور کا حاکم مقرر کر دیا۔
ادینا بیگ خاں جسے ارشاد شاہ نے دینا بیگ کہا ہے۔ دوابہ جالندھر کا حاکم تھا۔ جہاں اسے سکھوں کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے لکھووال کی جنگ میں سکھوں کو شکست فاش دی۔ ادینا بیگ خاں میر منّو کا دستِ راست تھا۔ میر منّو کی موت (۱۷۵۲ء) کے بعد لاہور پر چندے ادینا بیگ کی حکومت رہی لیکن احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر کے اسے لاہور سے نکال دیا۔ اور لاہور کی حکومت اپنے بیٹے تیمور شاہ کے سپرد کی۔ جس نے جہان خاں کو اپنا سربراہ مقرر کیا۔ تیمور شاہ ادینا بیگ سے ناراض تھا۔ ادینا بیگ بھاگ کر پہاڑیوں میں روپوش ہو گیا اور سکھوں کو حملہ کرنے کے لئے اکسانے لگا۔ جسا سنگھ نے لاہور پر حملہ کر کے پٹھانوں کو شکست دی اور خالصہ کے نام کا سکہ چلایا۔ ۱۷۵۸ء میں مرہٹے دلّی پر قابض ہوئے تو ادینا بیگ نے ان سے ساز باز کی اور رگھوبا کی فوج میں شامل ہو کر لاہور پر دھاوا کیا۔ سکھ مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور بھاگ گئے۔ افغانوں کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ مرہٹوں نے لاہور اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں نے ادینا بیگ خاں کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔ لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی اور وہ راہی ملک عدم ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شمالی ہند سے نکالنے کے لئے پانچواں حملہ کیا۔ مرہٹے اس کی یلغار کی تاب نہ لا کر دلّی کی طرف ہٹ گئے۔ لیکن احمد شاہ نے بلائے بے درماں کی طرح ان کا پیچھا کیا اور پانی پت کی جنگِ عظیم میں اُنھیں کچل کر رکھ دیا۔ جب احمد شاہ مرہٹوں کی جنگ میں مصروف تھا پنجاب میں سکھوں نے شورش برپا کی اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ لاہور پہنچا سکھوں کی فوج ستلج پار کر گئی۔ لیکن شاہ نے طوفان برق و رعد کی طرح انھیں جا لیا اور گھلو گھارا

کی خوں آشام جنگ میں انھیں شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں بیس ہزار سے زائد سکھ کام آئے۔ افغانستان واپس جانے سے پہلے شاہ نے کابلی مل کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔ ادھر سکھوں نے پھر لشکر جمع کیا اور قصور اور سرہند کے شہروں کو تاراج کیا۔ احمد شاہ نے پھر چڑھائی کی لیکن سکھ جنگ سے جی چراتے ہوئے فرار ہو گئے۔ شاہ کی واپسی پر سکھوں نے پھر ترغہ کیا اور لاہور کے صوبہ دار کو نکال باہر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات ۱۷۷۲ء کے بعد تیمور شاہ نے حملہ آور ہو کر ۱۷۷۹ء میں ملتان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن لاہور سکھوں ہی کے قبضے میں رہا۔ اس کے جانشین شاہ زمان نے چڑھائی کر کے ۱۷۹۸ء میں لاہور کو فتح کر لیا۔ لیکن پٹھان پنجاب میں اپنی حکومت قائم کرنے سے گریز کرتے رہے۔ شاہ زمان نے واپس جاتے وقت سکرچکیہ مثل کے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ کو لاہور کی حکومت کا فرمان لکھ دیا کیونکہ اس نے شاہ کی چند گری پڑی توپیں افغانستان بھجوائی تھیں۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کو اپنا صدر مقام بنا کر چاروں طرف حملے شروع کئے۔ پنجاب کے مسلمان سرداروں کھٹڑوں، ٹوانوں، آوانوں اور گکھڑوں نے اس کا جی توڑ کر مقابلہ کیا لیکن تربیت یافتہ سکھ فوج کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ اور وہ اطاعت پر مجبور ہو گئے۔ چند ہی برسوں میں کشمیر، ملتان اور پشاور پر بھی سکھوں کا راج مستحکم ہو گیا۔

وارث شاہ نے کچھ ایسے واقعات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں جن کی تحقیق کتب متداولہ سے نہیں ہو سکی۔

ع ڈیرا بخشی دا مار کے لٹ لیا فتح بانی پٹھان قصور دے نے

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بخشی کون تھا جسے نواب قصور نے شکست دی۔ قصور کے پٹھان سرداروں میں نواب نظام الدین خاں بڑا بہادر اور ہوشمند تھا۔ ۱۸۰۷ء میں اس خانوادے کے آخری نواب قطب الدین خاں نے رنجیت سنگھ کے ہاتھوں شکست کھائی۔ رنجیت سنگھ نے نواب موصوف کو ستلج کے دوسرے کنارے پر جاگیر دے کر قصور سے نکال دیا۔

ع جدوں زکریا خاں ختم کر کے بھکھی توپ پہاڑ تے جوڑیائی

نواب زکریا خاں نواب عبدالصمد خاں کا بیٹا تھا۔ جس نے فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کے

بدنام سردار بندہ بیراگی کو شکست دے کر اس کی غارت گری کا خاتمہ کیا تھا (۱۷۱۶ء) ان دونوں کے دورِ حکومت میں پنجاب میں سکھوں کو سر اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ نواب شاہنواز خاں جس کا ذکر سطور بالا میں آ چکا ہے نواب زکریا خاں ہی کا بیٹا تھا۔

۲۷ نواب حسین خان نال لڑیا جویں ابوسمند وِچ چوہنیاں دے

اس تلمیح کی بھی تحقیق نہیں ہو سکی۔ نواب حسین خاں لاہور کا ایک صوبیدار ہو گزرا ہے لیکن ابوسمند کا ذکر تاریخ میں نہیں مل سکا۔

تاریخی واقعات کے اس سرسری بیان سے اس غارت گری، سراسیمگی، دہشت اور قتل و غارت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جس کا سامنا اہلِ پنجاب کو ان حملوں اور لڑائیوں کے دوران کرنا پڑا۔ پٹھان بار بار چڑھائی کرتے۔ فاتحین کا لشکر جس علاقے یا قریے سے گزرتا اسے ٹڈیوں کی طرح ویران کر جاتا۔ رسد رسانی کے نام پر لشکری لوگوں کی بھیڑ بکریاں۔ گائیں بھینسیں۔ بیل گھوڑے ہانک کر لے جاتے۔ اناج کی کوٹھیاں خالی ہو جاتیں۔ سرسبز کھیتیاں حملہ آوروں کے گھوڑوں اور باربرداری کے جانوروں کے چارے کی نذر ہو جاتیں۔ لشکر کے جانے کے بعد کسان پھر جوں توں فصلیں کاشت کرتے جب انھیں کاٹ کر ذخیرہ کر لیتے تو اچانک ایک دن پھر افق پر گرد و غبار کی وہی بھیانک لکیر پھیل جاتی۔ لوگ گائیں بھینسوں کو جنگل میں چھپانے کی کوشش کرتے سونے چاندی کے زیور زمین میں گاڑ دیتے۔ غلّے کے انباروں کو ٹھکانے لگانے کیلئے دیوانہ وار دوڑ دھوپ کرتے لیکن اتنی فرصت کہاں۔ غبار کی چادر چاک ہوتی اور رسالے کے خشمگیں سوار گرد اڑاتے گھوڑے مارتے ان کے سروں پر آن پہنچتے۔ دہشت سے دل سینوں میں دھڑکنے لگتے۔ جوان عورتیں گھروں کے اندر گھس کر بیٹھی تھر تھر کانپنے لگتیں۔ کسانوں کے چہروں کا رنگ فق ہو جاتا۔ انکار کرنے کی مجال کسے تھی۔ جو کچھ بھی چھپایا ہوتا نکال کر ننگی تلواروں کے سائے میں ڈھیر کر دیتے اور دیکھتے دیکھتے سال دو سال کی کمائی سمیٹتا ہوا یہ لشکر آگے بڑھ جاتا۔[1] دیہات کے صابر و شاکر کسان پھر اپنے اپنے کام میں جُت جاتے

---

[1] ایک ضرب المثل ہے جو کھادا او دا لاہے دا باقی احمد شاہے دا۔ (جو کھا لیا وہ کام آیا باقی جو کچھ ہے وہ تو احمد شاہ ابدالی لے جائے گا۔)

اور اگلے سال کے حملہ آور لشکر کے لئے غلہ اگانے اور ڈھور ڈنگر پالنے میں مشغول ہو جاتے۔ یہ دو چار برسوں کی بات نہیں۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر سکھوں کی حکومت کے خاتمے (۱۸۴۹ء) تک یہی عالم رہا۔ پٹھانوں کے حملوں کے ساتھ ساتھ سکھ گردی جاری رہی۔ جب افغان لشکر آتا سکھ پہاڑیوں میں جا کر چھپ جاتے لیکن لشکر کے لوٹتے ہی اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آتے اور اس بے رحمی سے لوٹ مار کرتے کہ گاؤں کے گاؤں ویران ہو جاتے۔ سکھوں کے مسلح گروہ کو پنجابی میں دھاڑ کہتے تھے۔ یہ دھاڑیں اچانک دیہاتیوں پر ٹوٹ پڑتیں اور قتل و غارت کرتی ہوئی آگے نکل جاتیں۔ وارث شاہ نے اس ہمہ گیر تباہی اور بربادی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ چنانچہ قندھاری کٹک اور قندھاری تاخت کی ترکیبیں شعر میں علامت بن کر ان کی شاعری میں نفوذ کر گئیں۔

ع
تیرے نیناں دی نوکاں دے خط تیڑے واہڑ ملی اے جویں کٹاریاں نوں
حکم ہور دا ہور اج ہور ہویا اج ملی پنجاب قندھاریاں نوں
سُرمہ کجلہ کٹک قندھار دانی گولی نظر دی تاڑدی حیلیاں نے

کسی قوم کا اخلاقی تنزل اس کے سیاسی زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دولت و ثروت کی فراوانی سلاطین و اُمراء کو عیش و عشرت کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے اور وہ کنیزوں اور کسبیوں کی صحبت میں رہ کر امورِ مملکت سے یکسر غافل ہو جاتے ہیں۔ نظم و نسق کا شیرازہ بکھر جاتا ہے صوبائی اور ضلعی حکام من مانی کرنے لگتے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ عیش و تنعم کے سامان کی فراہمی کے لئے روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی چھوٹی اشیاء پر بھی محصولات عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ جس سے عوام کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور ان کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا جاتا ہے حکومت کا دبدبہ اور دبدبہ اُٹھ جاتا ہے۔ شہدے اور لُچے ہاتھ پاؤں نکالنے لگتے ہیں۔ اور شرفاء کو اپنی کھدروں میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کسبیوں کی بن آتی ہے۔ شرم و حیا کے پردے اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ فسق و فجور کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ زمیندار مزارعوں پر ظلم و ستم توڑتے ہیں اور عوام کی

زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ وارث شاہ ایک ذی شعور اور ذی احساس شاعر تھے انھوں نے بڑے دلدوز پیرائے میں اپنے عہد کی سیاسی اور معاشرتی زبوں حالی اور اخلاقی پستی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتے ہیں، ؎

جاہل فاسق ہُن جگ نوں مت دیندے دانشمند دی مُت خوار ہوئی
حق سچ دی گل نہ کرے کوئی جھوٹھ بولنا رسم سنسار ہوئی
مجلس لائیکے کرن حرام ایکا مبھو ہمان تیز کٹار ہوئی
صوبہ دار ناہیں حاکم شاہ کوئی رعیت ملک تے سب اکسار ہوئی
پیا مُلک دے وچ ہے بڑا دُولا ہر کسے دے ہتھ تلوار ہوئی
پردہ ستر حیا دا اُٹھ گیا سارا ننگی ہو کے خلق بازار ہوئی
چور چودھری یار تے پاک دامن بھوت منڈلی اک دو چار ہوئی
اشراف خراب کمین تازہ زمیندار نوں وڈی بہار ہوئی
سارے دیس تے جٹ سردار آہے گھر گھریں جاں نویں چار ہوئی
نڈوں شوق ہویا قصہ جوڑنے دا گل عشق دی آن اظہار ہوئی

اس زمانے میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق معطل ہو جانے کے باعث پنجاب کے دیہات میں ہر کہیں چودھری اپنے اپنے حلقوں میں خود مختار حاکم بن بیٹھے تھے اور رعیت کے جان و مال پر پورے متصرف ہو گئے تھے۔

؏ کلا کار تے جھاگڑ جٹ وڈے کھوہن مال ایہ جاندیاں راہیاں دا
؏ اشراف دی گل منظور ناہیں اتے چودھری چور لنڈور کیتے
؏ چوہڑے چودھری گنڈی پردھان کیتی ایہ اُلٹ اُولیاں روز ہویاں
؏ حال چور تے چودھری جٹ حاکم سماں ہور رائی رب دکھایائی

آج بھی ہمارے دیہات میں بعض چودھری بڑے بڑے رسہ گیر ہیں اور چوروں کی سرپرستی

کرتے ہیں۔ وارث شاہ کہتے ہیں کہ شرفا گمراہ ہو گئے ہیں اور شریف زادوں نے کنجروں کی عادتیں اختیار کر لی ہیں۔ جو لوگ صحیح معنوں میں عالی نسب تھے ان کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ فقرا کی یہ حالت ہے کہ وہ بدچلن عورتوں میں گھرے رہتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھرتے ہیں۔ ؎

رناں گندیاں گشتیاں گرد بیٹھن فقرا وڈے لکھ سوال دے نے

خاندان اشراف سب گم ہو گئے ہُن یار سب ال متوال دے نے

اشرافاں دے پُت بن گئے کنجر ہوئے دو رہُن راہ ضلال دے نے

منع ہوئی زکوٰۃ زناہ ودھیا ایہ نشان سب قحط یوال دے نے

کہتے ہیں کہ کوّے (چور غنڈے) باغوں میں اینڈتے پھرتے ہیں اور مور، چکور، تیتر (شرفا) بھوکوں مر رہے ہیں۔

؎ کاں کرن کلول وچ باغ بیٹھے تیتر، مور، چکور بھکھ جالدے نے

وارث شاہ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس ہمہ گیر جبر و تشدد کے عالم میں مظلوم اور کمزور عوام کی حالت نہایت سقیم تھی۔ وہ بار بار مختلف پیرایوں میں عوام کی زبوں حالی اور مظلومیت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مظلوم اور غریب جنہیں پیروں تلے روندا جا رہا ہے ڈر کے مارے حرفِ شکایت زباں پر نہیں لا سکتے۔

؎ وارث شاہ لتاڑی دے پے ماڑے مارے خوف دے مونھوں نہیں بولدے نے

ان حالات میں غریبوں کی خوبیاں دب کر گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اور دوسرے غریبوں کے سوا کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

؎ گن ماڑیاں دے سبھے رہن وچے ماڑے ماڑیاں تے دکھ پھولدے نے

سب لوگ غریبوں کو جھٹلاتے ہیں امرا کو جھٹلانے کی جرأت کسی میں نہیں ہوتی

؎ شاندار نوں کرے نہ کوئی جھوٹا جھوٹا کرن کنگال نوں ٹولدے نے

لوگ اقبال مند امیروں کی خوشامد کرتے ہیں غریبوں کی غمخواری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا

ع طالع منداں دیاں لکھ خوشاماں نے اتے غریب دا کوئی غمخوار ناہیں

غریبوں کے پاس توشک لحاف کہاں وہ چپ چاپ جاڑے کی ٹھر کا دکھ سہتے رہتے ہیں۔

ع جنہاں لیف دے نہیں آرام دیکھے سوئی بھوگدے دُکھ سیال دے نے

طاقتور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ غریب بے چارے ہار ماننے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔

ع ڈاہڈے ماڑیاں نوں دھاڑ ماڑ کردے تدراں وراں لگے انت ہاریاں نی

آج دو سو برس گذر جانے کے بعد بھی دیس پنجاب کے کسان اور مزارع ویسے ہی مظلوم و مقہور ہیں جیسے کہ وارث شاہ کے زمانے میں تھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اب ان میں طبقاتی شعور پیدا ہو گیا ہے اور لیٹ کر مار کھانے کے بجائے انھوں نے اپنے حقوق کے لئے مردانہ وار جد و جہد شروع کر دی ہے۔ وارث شاہ کسانوں کی مظلومیت کے ذکر پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُنہیں اپنی قوت کا احساس اور شعور بھی دلاتے ہیں اور بیداری کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

ع تینوں رب سبھ بنایا سی جینوں کرتباں نال توں آل آپے

وارث شاہ نے اپنے زمانے کے کٹھ ملاؤں اور قاضیوں کی ریاکاری اور مکر و فریب کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ "رب دے مارے" شریعت کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر ہمیشہ اس شخص کی حمایت کرتے ہیں جو انھیں رشوت دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنی غرض براری کے لئے دینی علوم پڑھتے ہیں لیکن احسان خلق خدا پر دھرتے ہیں۔ یہ ہر وقت نئے سے نئے شکار کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔

ع نت شہر دے فکر غلطان رہندے ایہو چاٹ ہے رب دیاں ماریاں نوں
چھتوں لیوندے او سدی گل کردے چھڈ شرع دے قول قراریاں نوں

ع پڑھیں نفس دے واسطے علم سارے اُتے خلق دے کریں احسان ہیں تے
وارث شاہ شکار نوں پھریں بھوندا وچ دولتاں بڑا غلطان ہیں وے

پھر کہتے ہیں ؎

شکل مومناں دی کم موذیاں دا اینہاں اصل شیطان دیاں دادیاں نے

جس نے دغے فریب تے لک بدھا سبھو ڈوبیاں آ دجگا دیاں نے

جدوں جگ جہان تے سوگ ہوئے تدوں قاضیاں دے گھر شادیاں نے

اوہ محروم ہوئے رحمت رب دی توں جہناں دوڑھیاں چیریاں کھادیاں نے

ملاؤں اور قاضیوں کی ابلہ فریبیوں کے ساتھ وارث شاہ پیرانِ سالوس کی زہد فروشی اور دکانداری کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ وارث شاہ نے اس طائفہ کی دسیسہ کاریوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے پیر پورے گرو گھنٹال ہیں اور امردوں کو اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں انھوں نے فریب کا جامہ اوڑھ رکھا ہے ہر وقت اپنے نفس کی پرورش میں مصروف رہتے ہیں انھیں نماز روزے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ لوگوں سے قدم بوسی کرانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ خواہ مرید کے بیوی بچے بھوکے مر رہے ہوں۔ پیروں کو اپنے نذرانے سے کام ہوتا ہے۔ یہ شیطان ظالم لٹیرے ہیں اور غریبوں کے تن سے کپڑے بھی اتروا لیتے ہیں۔ سلوک و عرفان کو بدنام کرتے ہیں اور بُرے افعال کے ارتکاب میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ جب پیر جی نزولِ اجلال فرماتے ہیں تو موٹی تازی عورتیں انھیں گھیر لیتی ہیں اور انھیں دیکھ دیکھ کر پیر جی خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ انھوں نے دکھاوے کے لئے فقر کا جامہ اوڑھ رکھا ہے اور عمامہ، ریش دراز، سیلی ٹوپی سے لیس رہتے ہیں۔ ؎

دکھیوا ایس زمانے دے پیر برباد کر دے مکر سب گرو گھنٹال دے نے

خوشیاں نال فریب دا پہن جامہ گھتن باگلے وچ بھونچال دے نے

بھاویں ٹبر مرید دا مرے بھکھا پیر اپنے نفس نوں پال دے نے

فرض سُنتاں دا جیاں ترک کر کے ہتھ دوڑدے پیر دے خیال دے نے

ایہ شیطان شطونگڑے وڈے ظالم لٹیرے عاجزاں لاہ پڑتال دے نے

سگوں پیری دے نام نوں لج لائی مردود ایہ فعل افعال دے نے

رناں ویکھ مشٹنڈیاں ہون راضی جدوں سائیں ہوری ڈول ڈال دے نے

کڑ سیلیاں ٹوپیاں بہن باناں پگڑ استرا ریش زوال دے نے

پنجاب۔۔۔ کی سادہ لوح دیہاتیوں کے دل و دماغ پر آج بھی کٹھ ملاؤں اور پیرانِ سالوس کا تصرف باقی و برقرار ہے۔ اگرچہ علومِ جدیدہ کی اشاعت کے ساتھ ان لوگوں کی دین فروشی اور مکاری کا طلسم ٹوٹتا جا رہا ہے۔

وارث شاہ نے انگریزوں کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے تسلط کا بھی جائزہ لیا۔ وہ انگریزوں کے مکر و فریب اور فتنہ پردازی کا وقوف رکھتے تھے۔ بالناتھ جوگی کی زبانی کہتے ہیں۔

ع ڈِٹّھے تیج دریج ایہ جاندائی کلا کار استاد فرنگ دائی

انھوں نے انگریز عورتوں کی بے پردگی پر بھی طنز کیا ہے۔

ع مومنات نوں ستر دی قید بہتر آزادی بھاوندی سب کراناں نوں

وارث شاہ مساوات پر کامل یقین رکھتے تھے۔ کہتے ہیں

ے سید شیخ نوں پیر نہ جاننائی عمل کرے جے اوہ چنڈال دے نے
چوہڑا ہووے جے ترک حرام مُسلم مسلمان سب اُس نوال دے نے

مساوات کے انقلابی تصور کی ترجمانی کیسے عمدہ اور پُرزور پیرائے میں کی ہے کہتے ہیں کہ سید یا شیخ کو مرشد نہیں مانا جا سکتا اگر وہ چوہڑے چماروں جیسے کام کرے۔ دوسری طرف چوہڑا چمار حرام خوری ترک کر کے مسلمان ہو جائے تو وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔

محوّلہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ ہر عظیم شاعر کی طرح سیاسی، طبقاتی اور سماجی شعور سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ انھوں نے جس سیاسی اور سماجی ماحول میں زندگی گذاری اس کا بنظر غائر مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا تھا۔ چنانچہ ہیر وارث شاہ کے اوراق میں معاصر سماج کی جو سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں وہ تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہیں ملیں گی۔

ہیر وارث شاہ پر اعتراضات

وارث شاہ کے معترضین کہتے ہیں کہ :

1. وارث شاہ نے ہیر (کتاب) کا دامن فحاشی سے داغ دار کر دیا ہے۔
2. عورت کی تنقیص کی ہے۔
3. ہندوؤں کی کتھائیں لکھی ہیں۔

اوراقِ آئندہ میں ہم دیکھیں گے کہ یہ اعتراضات کس حد تک درست ہیں۔ سب سے پہلے ہم فحاشی کے الزام کو لیں گے۔

فحاشی مذہب، اخلاق، قانون اور ادب و فن کا ایک مشترک اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے بعض کتابیں جنھیں انگلستان میں فحش سمجھ کر ممنوع الاشاعت قرار دیا گیا ہے اضلاعِ متحدہ امریکہ میں بے روک ٹوک چھپتی ہیں اور جنھیں اضلاعِ متحدہ امریکہ میں چھاپنے کی اجازت نہیں ہے ان کی اشاعت پر فرانس، سویڈن اور ڈنمارک میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ حالانکہ یہ سارے ممالک عیسائی ہیں اور بہ ادنیٰ تغیّر ایک ہی ضابطۂ قانون (کامن لا) کے پابند سمجھے جاتے ہیں۔ اِن حالات میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا کوئی معیار ایسا بھی ہے جس کی بنا پر ہم کسی نظم یا نثر پارے کو فحش قرار دے سکیں؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہمیں تمدّن کے ابتدائی دور سے

رجوع لانا پڑے گا۔

زرعی انقلاب کے بعد جو مذاہب وجود میں آئے ان کا اساسی تصور قدرتاً بارآوری اور زرخیزی پر مبنی تھا۔ فصلوں کے پنپنے کا انحصار بروقت مینہ برسنے پر تھا۔ اس لئے برق و رعد کے دیوتاؤں کی پرستش کا آغاز ہوا۔ ارض کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں۔ چنانچہ مادرِ ارض، مادر مہربان، مادر کبریٰ کے نام سے ارضی دیوی کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت میں ہل چلانے کا عمل اور جنسی ملاپ کا فعل یکساں طور پر ثمر آور تھے اس لئے جنسی اعضا اور جنسی ملاپ کو زرعی معاشرے کے ابتدائی دور میں بیش از بیش اہمیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ مصرِ قدیم، سمیریا اور موئن جو دڑو کی شہری ریاستوں میں اعضائے تناسل کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ ارضی دیویوں کے معبدوں میں ہزاروں "دیوداسیاں" رکھی جاتی تھیں جن سے دیوی کے نام پر چند ٹکے دے کر پجاری اور یاتری فیض یاب ہوتے تھے۔ اُس زمانے کے بت پرستوں کا خیال تھا کہ اس "مقدس جنسی ملاپ" سے اراضی کی زرخیزی کو تقویت پہنچتی ہے — برٹرنڈرسل نے اپنی کتاب "شادی اور اخلاق" میں کہا ہے کہ عصمت فروشی کا آغاز مذہب کے دامن ہی میں ہوا تھا۔ جیسا کہ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے۔ بابل میں "مقدس عصمت فروشی" دیوداسیوں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ بابل کی ہر عورت کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار عشتار دیوی کے معبد میں چند سکوں کے عوض کسی نہ کسی زائر سے جنسی ملاپ کرنا پڑتا تھا۔ فصلوں کے بونے اور کاٹنے پر جو تیوہار منائے جاتے تھے ان میں جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی تھی۔ عشتار، آئسس، بکیس، دیونیسس وغیرہ دیویوں اور دیوتاؤں کے تیوہاروں پر جلوس نکالے جاتے تھے۔ جن کے آگے آگے لوگ لنگ کے مجسّمے اٹھا کر چلتے تھے۔ جنسی اعضاء کے تعویذ ہوا کر گلے میں لٹکائے جاتے تھے۔ یا بازوؤں پر باندھے جاتے تھے۔ نظرِ بد سے بچنے کے لئے بھی لنگ کے مجسّمے گھروں میں رکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں جنسی اعضا یا جنسی ملاپ کے ساتھ کسی قسم کا ٹیبو روابستہ نہیں تھا۔ اور غالباً اسی لئے قدیم بت پرست گناہ کے تصور سے بھی آشنا نہیں تھے۔ ہزاروں برسوں تک یہی حالت رہی تا آنکہ اسرائیلی مذاہب کی اشاعت سے جنسی اخلاق کا ایک نیا تصور پیدا ہوا۔ جنسی اعضا اور جنسی ملاپ کا برملا ذکر

ٹیبو قرار پایا۔ اور جنسیات کے ساتھ گناہ اور جرم کے احساسات وابستہ ہو گئے۔ فحاشی کا تصور اسی احساسِ معصیت کا پروردہ ہے۔ مسیحی اولیاء پال، آگسٹائن وغیرہ عورت کو جنسی ترغیب و کشش کا پیکر سمجھتے تھے اور اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مصر میں رہبانیت کی ترویج ہوئی تو سیکڑوں راہب عورت کی کشش سے محفوظ رہنے کے لئے پہاڑوں اور صحراؤں کو نکل گئے۔ ان کے خیال میں عورت شیطان کے ہاتھ میں ایک خطرناک آلۂ کار ہے جس کی مدد سے وہ نیکوں کو گمراہ کرتا ہے وہ جنسی فعل کو تمام برائیوں کی جڑ مانتے تھے۔ کلیسائے روم نے مذہبی پیشواؤں اور تارک الدنیا عورتوں پر تجرد کی کڑی پابندی لگادی۔ رفتہ رفتہ عورت اور جنس کے خلاف یہ غیر فطری تعصب عالم عیسائیت میں ہر کہیں نفوذ کر گیا۔

اہلِ مغرب کا قانون بنیادی طور پر رومۃ الکبریٰ کے ضابطۂ قوانین کا چربہ ہے جس پر مقامی و ملکی رسوم و شعائر کا پیوند لگا دیا گیا ہے۔ روما کا قانون کئی صدیوں میں صورت پذیر ہوا تھا۔ ابتدائی دور میں رومی شوہر اس بات کا مجاز تھا کہ وہ اپنی زوجہ کو کسی مرد کے ساتھ قبیح حالت میں پکڑ لے تو اسے وہیں قتل کر دے۔ عدالتوں سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بعد میں شوہر کا یہ حق سلب کر لیا گیا۔ رومی جنسی اخلاق قدما یونان کے اخلاق سے ملتا جلتا تھا۔ اور یونانیوں کا نظریہ یہ تھا کہ بیوی بچے جننے کے لئے، رنڈی لطفِ صحبت کے لئے اور لونڈی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ روما میں شہنشاہی کے نفاذ کے ساتھ جنسی بے راہ روی کا دور دورہ ہوا۔ قسطنطین نے عیسائیت قبول کی تو اس نے عیسائی اخلاق کی روشنی میں جنسی قوانین کو مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ جہاں تک جنسی مواصلت کا تعلق ہے زنا کے بارے میں روما کے قانون جرم و سزا اور عیسائی تعصب کا امتزاج ہوا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں سائنس اور فلسفۂ جدید کے فروغ کے ساتھ عیسائیت کو ضعف آ گیا۔ اور آج یہ عالم ہے کہ اہلِ مغرب محض نام کے عیسائی ہیں۔ جنسی معاملات میں وہ کھلم کھلا بت پرست یونانیوں کی جنسیاتی آزادہ روی کی طرف مراجعت کر رہے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی ہے کہ اس کے ساتھ وہ اس احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہیں جو جنسی مواصلت کے

بارے میں عیسائیت نے ان کے ذہن و قلب میں راسخ کر دیا ہے اور جس سے مفر کی کوئی بھی صورت انھیں دکھائی نہیں دیتی۔ نتیجتہً وہ کربناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کبھی تو وہ ایسی کتاب کو ممنوع الاشاعت قرار دیتے ہیں جس میں جنسی مواصلت کا ذکر فن کارانہ انداز میں کیا گیا ہو۔ اور کبھی ایسی کتابوں کو چھاپنے کی اجازت بھی دے دیتے ہیں جن میں جنسی ملاپ کا ذکر محض ہیجانِ لذت کے لئے کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے ناقدین فحاشی کا کوئی قاطع و مانع مفہوم متعین نہیں کر پائے۔ اسی ذہنی تردد کے باعث فحاشی عدالتوں کے لئے بھی معمہ بن گئی ہے۔ راقم کے خیال میں وہ تحریریں یا فلمیں حتمی طور پر فحش ہیں جو کسی فن کارانہ تقاضے کو پورا نہیں کرتیں یا عشق اور مزاح سے عاری ہوتی ہیں۔ گویا آرٹ یا مزاح یا عشق ہی کو کسی تحریر کے فحش یا پاکیزہ ہونے کا معیار بنایا جا سکتا ہے۔ مصوری کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایسی مادر زاد برہنہ تصاویر پر جو جسم کے زاویوں کی لطافت، خطوط کی دلآویزی اور خدو خال کی رعنائی کو اُجاگر کرتی ہیں فحش کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ ان کے نظارے سے ہوا و ہوس کی تحریک نہیں ہوتی۔ بلکہ تناسب اعضاء کا جادو دیدہ و دل کو رفعت عطا کرتا ہے۔ ایک پُرشباب مُتناسب الاعضا حسینہ کے جسم سے زیادہ تو دُنیا کی کوئی چیز خوبصورت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جن فلموں میں محبت کرنے والوں کی مُلاعبت کے مناظر دکھائے جائیں اُنھیں فحش نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ جذبۂ عشق کا خلوص انھیں پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس "نیلی" اور "پیلی" فلمیں سراسر ہوس انگیز ہوتی ہیں۔ اس لئے اُنھیں فحش سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنسی مواصلت بذات خود ایک فطری فعل ہے اور نسل کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ حیوانات بھی فطرت کا یہ تقاضا پورا کرتے ہیں اور بعض دفعہ برسرِعام کرتے ہیں۔ لیکن ان پہ فحاشی کا الزام نہیں لگایا جاتا۔ انسان ذی شعور و ذی عقل ہونے کے باعث اپنے فطری تقاضوں کی تشفی ایسے طریقوں سے کرتا ہے جو اسے حیوان سے ممتاز کرتے ہیں۔ عشق و محبت نے جنسی ملاپ کو خالص انسانی شائستگی کا پیرایۂ اظہار بخشا ہے۔ عشق وہ کٹھالی ہے جس میں حیوانیت کی میل کچیل الگ ہو جاتی ہے اور انسانیت کا سونا نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ شیکسپیئر "وینس اور اڈونس" میں کہتا ہے:

Love Surfeits Not, Lust Like a Glutton Dies

Love is All Truth, Lust Full of Forged Lies

آرٹ حسن کی ترجمانی کرتا ہے۔ حسن عشق کا پروردہ ہے۔ عشق جنسی جبلت کا زائیدہ ہے۔ لہذا جب عشق و محبت کے حوالے سے ادبیات اور آرٹ میں جنسی ملاپ کا ذکر آئے گا تو ہم اسے فحش نہیں کہہ سکتے۔ فحاشی جذبۂ ہوس (Lust) کی غیر جذباتی (Cold-Blooded) تعبیر و ترجمانی کا نام ہے۔ مزاحاً جنسی ملاپ کا ذکر کیا جائے تو بھی اسے فحاشی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ سامع بے اختیار مسکرانے لگتا ہے یا کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے۔ یہ ہنسی نہ صرف جذبۂ ہوس کے بھڑک اٹھنے میں مانع ہوتی ہے بلکہ دل کے انبساط اور ذہن کے پھیلاؤ کا باعث بھی ہوتی ہے۔ یہی بات ہم ہجو یا گالی کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا ردِ عمل شگفتہ خندہ کا باعث نہیں ہوتا بلکہ دل میں تنگی اور تلخی پیدا کرتا ہے۔ ہجو دل کے پھیلاؤ کے بجائے انقباض کا باعث ہوتی ہے۔ احساس کی یہ جراحت ہجو یا گالی کو فحش بنا دیتی ہے۔ کیونکہ گالی دینے والا یا ہجو کرنے والا مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ عشق و مزاح دونوں قلب و نگاہ کی رفعت اور انبساط کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا فنکارانہ اظہار لازماً فحاشی سے پاک ہوتا ہے۔

انگریزی میں فحش نگاری کے لئے Pornography کی ترکیب ہے۔ جو یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ یونانی میں ornaca قحبہ خانے کو کہتے تھے۔ اس ترکیب کا مطلب ہوا قحبہ خانے میں جنسی ملاپ کی وصف نگاری۔ یہ ترکیب اپنے مفہوم و معنیٰ میں بڑی محدود اور ناقص ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے فحاشی کا ارتکاب گویا قحبہ خانوں ہی میں کیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے اس سے مراد فحش نگاری ہی لی جاتی ہے۔ قحبہ خانوں میں جنسی ملاپ کی تفصیل نگاری یقیناً فحش ہوگی۔ کیونکہ ان میں طالب و مطلوب کا نقطۂ نظر محض کاروباری ہوتا ہے اور اس میں عشق و محبت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ بعض تماش بین کسبیوں سے محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن اس میں خلوص نہیں ہوتا۔ محبت کا نام لے کر جنسی ملاپ کو زیادہ پرکشش بنانا مقصود ہوتا ہے۔ عصمت

فروشی اور فحاشی لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن عشق و محبت کا اعجاز سمجھئے یا آرٹ اور ادبیات کی کرامات جانئے کہ دنیائے ادب میں کسبیوں کے بعض کردار ایسے بھی ہیں جن پر فحاشی کی زد نہیں پڑتی مثلاً زولا کی "ناناً"۔ وادے کی "سیفو"۔ موپاساں کی "چربی کی گیند"۔ رسوا کی "امراؤ جان ادا" کالیداس کی "وسنت سینا"۔ عشق یا وطنیت کے جذبات نے اسفل کو اعلیٰ اور ناپاک کو پاکیزہ میں بدل دیا ہے۔ سومرسٹ ماہم نے بھی کسبیوں کی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ لیکن لذتیت کے باعث اس کے کردار قحبہ خانے کی سطح سے بلند تر نہیں ہو سکے۔ اس کا جواز عام طور سے حقیقت نگاری کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ بے شک عصمت فروشی ایک حقیقت ہے لیکن فن کار یا ادیب کا منصب زندگی کے حقائق کو من و عن پیش کرنا نہیں ہے کہ اس صورت میں ادب محض صحافت بن کر رہ جائے گا۔ بلکہ انھیں ایسی حیثیت عطا کرنا ہے جو ہوس انگیزی کی میل کچیل کو دور کر کے انسانیت کے کندن کو اُجاگر کر دکھائے۔ فن کار اور ادیب ایک کیمیاگر کی طرح معمولی دھاتوں پر فن کارانہ عمل کر کے انھیں زر خالص یا آرٹ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جو کیمیاگر مس خام کو مس خام ہی کی صورت میں پیش کرے گا اسے ہم کیمیاگر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح جو ادیب یا فن کار زندگی کے حقائق کو اپنے اصل معروضی رنگ میں پیش کرتا ہے وہ جو کچھ بھی ہو ادیب یا فن کار ہرگز نہیں ہے۔

ڈی۔ ایچ لارنس کی "Lady Chatterly's Lover" اور نابوکوف کی "Lolita" فحش ہیں کیونکہ ان میں جنسی ملاپ کا ذکر غیر جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ فرینک ہیرس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "میری زندگی اور معاشقے" میں اپنی قوتِ رجولیت اور جنسی کشش کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ جذبۂ محبت کے فقدان نے اس کتاب کو فحش بنا دیا ہے۔ اس سے پہلے کساتووا نے بھی اپنے معاشقوں کی تفصیل لکھی تھی لیکن اس میں کہیں کہیں عشق کی حرارت موجود ہے۔ ہلر کی "خطِ سرطان" صریحاً فحش ہے کہ اس کے جنسی ملاپ کے ذکر میں سادیت اور کلبیت کا رنگ آ گیا ہے۔ اس کے برعکس ریڈکلف ہال کا "تنہائی کا کنواں" اور ژول رومین کا "Body's Rapture" فحش نہیں سمجھے جائیں گے۔

کہ انھیں پڑھتے ہوئے ذہن و قلب چاہنے والوں کے خلوصِ جذبہ اور عاشقانہ وارفتگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم جنسی محبت کو عام طور سے کجروی سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جدید نفسیات کی رُو سے یہ رجحان بعض لوگوں میں خلقی ہوتا ہے۔ "تنہائی کا کنواں" میں ایک ایسی ہی عورت کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ فحش نگاری میں کلیوی لینڈ کی "فینی ہل" خاصی بدنام ہے۔ جب فینی ہل پہلی بار والہانہ انداز میں اپنے آپ کو اپنے محبوب چارلس کے سپرد کرتی ہے تو یہ منظر یقیناً فحش نہیں ہے۔ لیکن جب وہ عصمت فروشی کا دھندا اختیار کرتی ہے اور نوربرٹ کے ساتھ خلوت میں اپنے آپ کو باکرہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس منظر کو فحاشی کی بدترین صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" میں جنسی ملاپ کا منظر فحش ہے۔ کیونکہ خلوت کے عالم میں زنِ ثانی کی طرف سے رواں تبصرہ (Running Commentary) جاری رہتا ہے جو نہایت ہوس پرورہے۔ اور جس سے لکھنؤ کے "بنا و اصاحب" یاد آجاتے ہیں۔ اسی طرح داستانوں میں فحاشی کے مناظر جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ "بوستانِ خیال" میں ایک صاحب جو کسی کو دکھائی نہیں دیتے رنڈیوں کے جھرمٹ میں قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ مثنوی "زہرِ عشق" کے بعض حصے اور ریختی سراسر فحش ہیں کہ ان کا مقصد ہی ہوس ناکی کی اشتعالک ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ عشق کی طرح مزاح بھی کسی ادب پارے یا نظم کو فحش ہونے سے بچا لیتا ہے۔ اس کی مثالیں عبید زاکانی کے لطیفے اور مثنوی مولانا روم کی بعض حکایات ہیں۔ عبید زاکانی کی ظرافت بے پناہ ہے۔ اس کے لطیفے پڑھتے ہی آدمی بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح ہوس ناکی سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ مولانا روم کی بعض حکایات کو فحش کہا جاتا ہے لیکن ان میں بھی کہیں نہ کہیں مزاح کا پہلو نکل ہی آتا ہے۔ جو دل کے انبساط کا باعث ہوتا ہے: "کنیزک و خر" کی حکایت کو بھی کدو کے ذکر نے ظریفانہ رنگ دے دیا ہے۔ اسی طرح "خواجہ و غلام"، "ملا و کنیزک" اور "جوجی و واعظ" کی حکایات پڑھ کر بھی انسان بے اختیار ہنس دیتا ہے اور جنسیاتی لذتیت اور ہوس ناکی کی جانب اس کا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس سوزنی، انوری اور خاقانی کی ہجویں نہایت فحش ہیں کہ ان کا مقصد مخالفین کو ذہنی اذیت پہنچانا ہے۔

یہی سادیت اور طنز ہجو کو فحش بنا دیتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہم دیکھیں گے کہ وارث شاہ پر فحش نگاری کا الزام کہاں تک درست ہے۔ ہیر ایک مدت کی جدائی کے بعد اپنے محبوب اور چاہنے والے رانجھے سے باغ میں جا کر ملاقات کرتی ہے خلوت میں دونوں کے ارمان سُلگ اُٹھتے ہیں اور وہ بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ وارث شاہ نے دونوں کی مواصلت کا ذکر صرف ایک شعر میں کیا ہے۔

یار و ڈگی اندھیری عشق والی اُڈ شرم و حیا دی بگ گئی

وارث شاہ رب جوڑ دا جوڑیاں نوں کھُب چھاپ اندراج نگ گئی

جب ہیر رانجھے کے وصال سے شادکام ہو کر گھر لوٹتی ہے تو اس کی سہیلیوں کو اس بات کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے فقرے کسنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی فقرے بازی خاصی طویل ہے اور یہی وہ مقام ہے جسے فحش نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چاہنے والوں کی مواصلت کی تفصیل نگاری دنیا بھر کی عشقیہ شاعری کی ایک معروف روایت ہے۔ عربی میں امرء القیس فارسی میں نظامی گنجوی، سنسکرت میں جے دیو، لاطینی میں اووڈ نے اس روایت کی آبیاری کی ہے۔ وارث شاہ نے وصال کی منظر نگاری میں حد درجہ ضبط سے کام لیا ہے۔ جب کہ مولہ بالا شاعروں اور تمثیل نگاروں نے اس مقام پر خوب خوب پیر پھیلائے ہیں۔ ہیر کی سہیلیوں نے ہنسی چہل میں جو کچھ کہا اور جس مزاحیہ پیرائے میں کہا اس پر فحاشی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ آج بھی برِ عظیم پاک و ہند میں نوک جھونک کی یہ روایت موجود ہے۔ اس چھیڑ چھاڑ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب دُلہن عروسی جوڑا پہن کر اور بن سنور کر سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھتی ہے۔ اس کی بیاہی ہوئی سہیلیاں اشاروں کنایوں میں مزاحاً آئندہ پیش آنے والے واردات سے اسے باخبر کرتی ہیں۔ اُن کی باتیں سُن سُن کر کنواری لڑکیاں پلوؤں میں منہ چھپا چھپا کر ہنستی ہیں اور ان کے چہرے شرم سے لال بھبوکا ہو ہو جاتے ہیں۔ دُلہن سسرال سے لوٹ کر آتی ہے تو بڑی بوڑھیوں سے الگ تھلگ ایک اور محفل بپا ہوتی ہے۔ سہیلیاں دُلہن کو گھیر لیتی ہیں۔ اور کرید کرید کر شبِ زفاف

کے واردات اس سے پوچھتی ہیں۔ دُلہن جھینپ جھینپ جاتی ہے اور مُوسلے ہاتھوں سے انھیں مار مار کر الگ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ آخر اسے کچھ نہ کچھ بتانا ہی پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں مزاحیہ پیرائے میں ہوتی ہیں۔ وارث شاہ نے اپنے معاشرے کی اِس روایت کی شرح و بسط سے ترجمانی کی ہے۔ از بسکہ اُن کا پیرایۂ بیان فن کارانہ اور مزاحیہ ہے۔ اس لئے ان اشعار پر فحاشی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

وارث شاہ نے گڈریوں، ملاحوں اور جاٹوں کی زبان سے کہیں کہیں ایسا روز مرہ بھی استعمال کیا ہے جس پر بعض لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دیہاتیوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ علماء کی زبان بولیں گے۔ وارث شاہ نے یہاں بھی مقتضائے حال کا خیال رکھا ہے اسی بات کو ارسطو، فینیس، رسے بیلے، مولیئر اور شیکسپیئر میں استحسان کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "ہنری چہارم" میں فالسٹاف اور پسٹل کا مکالمہ اس کی عمدہ مثال ہے۔

وارث شاہ پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے جا بجا عورت کی تنقیص کی ہے۔ تنقیصِ زن کی روایت پدری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہے۔ جس میں مرد کو عورت پر برتر سمجھا جاتا تھا۔ زرعی انقلاب کے اوائل میں اکثر اقوامِ عالم میں مادری نظامِ معاشرہ قائم تھا۔ اور عورت کو اس معاشرے کا مرکز و محور سمجھا جاتا تھا۔ عورت ہی نے پہلے پہل بیج بونے اور فصلیں اُگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ مرد شکار کے لئے جنگلوں کا رُخ کرتے تو عورت فراغت کے وقت میں زمین کھود کر بیج بونے کے تجربے کیا کرتی۔ ابتدا میں گیہوں ایک جنگلی خود رَو پودا تھا۔ عورت بیج بو کر گندم کے پودے اگانے لگی۔ مرورِ زمانہ سے مرد فصلیں اُگانے کی اہمیت سے آشنا ہوا اور اس نے دریاؤں کے کناروں پر کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ زمین کے بطون سے فصل اُگتی تھی اور عورت کی کوکھ سے بچے پیدا ہوتے تھے اس لئے عورت زمین کی تمثیل بن گئی اور مادرِ ارض کی صورت میں علم الاصنام میں نمودار ہوئی۔ مادری نظامِ معاشرہ صدیوں تک قائم رہا۔ اس میں مرد کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ بچے اپنی ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے لیکن زرعی معاشرے کے استحکام کے ساتھ صورتِ حالات

بدل گئی۔ بستیاں شہروں میں تبدیل ہوگئیں۔ ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ طاقتور سردار بن بیٹھے اور اراضی کے سیر حاصل قطعات پر متصرف ہوگئے۔ لوٹ کھسوٹ کے شوق میں فوجی دستے مرتب کئے اور جنگ و جدال کا آغاز ہوا۔ مرورِ زمانہ سے پرانی قدریں بدل گئیں۔ مرد کی سیادت عورت پر قائم ہو گئی کیونکہ وہ زیادہ تندرو اور جری تھا۔ ذاتی املاک کا تصور، مذہب، ریاست، قانون، مذہب اور اخلاق میں بار پا گیا۔ حتیٰ کہ عورت بھی شخصی املاک بن کر رہ گئی۔۔۔ عہد نامۂ قدیم میں عورت کو گائے بیل کے ساتھ ذاتی املاک ہی میں شمار کیا گیا ہے۔۔۔ مرد نے عورت کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو وہ گائے بیل سے کرتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کو بھی ڈھور ڈنگروں کی طرح سربازار خریدا اور بیچا جانے لگا۔ سلاطین و امراء نے ہزاروں کنیزیں اپنے محلوں میں ڈال لیں۔ تاجروں نے قحبہ خانے قائم کئے۔ اور عصمت فروشی کا کاروبار مندروں کے باہر بھی ہر کہیں پھیل گیا۔ عورت مرد کی تفریح طبع کے لئے محض ایک کھلونا بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ عورت کو وہی کچھ بننا تھا جو مرد اُسے بنانا چاہتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے دروازے اس پر بند تھے۔ عورت کو اخلاقی پستی اور ذلت کے گڑھے میں دھکیل کر مرد الٹا اس پر طعن کرنے لگا اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ آج بھی مردوں کی ریاکاری کا یہ عالم ہے کہ راتوں کو چھپ چھپ کر کسبیوں کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن دن کو کہیں ان کا سامنا ہو جائے تو نفرت اور حقارت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ کتابیں لکھنے والے مرد تھے اس لئے انھوں نے عورت کا ذکر نہایت حقارت سے کیا اور انھیں مکار، فریبی، ہرجائی، ناقابلِ اعتماد ہوس پرست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس تذلیل و تنقیص کی تہ میں دراصل مرد کا احساسِ جرم کارفرما تھا وہ لاشعوری طور پر جانتا تھا کہ خود اس نے عورت کو پستی کی اس حد تک پہنچایا ہے۔ احساسِ جرم کی اس خلش سے نجات پانے کے لئے اس نے عورت کو تمام معائب کا پُتلا ثابت کیا۔ ادبیاتِ عالم میں تنقیصِ زن کی روایت ہر کہیں دکھائی دیتی ہے۔

"بسا اوقات عورتیں اپنے شوہر کو تنگ دھار کے تلخ گھونٹ پلاتی ہیں اور آشناؤں کو محبت کا شیریں ذائقہ چکھاتی ہیں۔"

(ابو العلا معری۔ لزومیات)

• عورت کا دماغ ایسا ہے جیسا کہ لگڑ بگڑ کا ۔" (رگ وید)

" عورتوں کے حربے ہیں : دھوکا دینے والی باتیں، مکر، قسمیں کھانا، بناوٹی جذبات کا اظہار، جھوٹ موٹ کے آنسو بہانا، بناوٹی مسکراہٹیں، دکھاوے کے دکھ درد کا اظہار، بے معنی خوشی و تغافل، بے معنی سوالات پوچھنا، خوشحالی اور افلاس میں بے نیازی کا اظہار، نیک و بد میں تمیز نہ کرنا، چاہنے والوں کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھنا ۔" (سوک سپ تتی، سنسکرت)

• ایک اچھی بیوی سفید کوّے کی طرح نایاب ہے ۔" (جونیال)

• عورت ایک مندر ہے جسے بدررَو کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے ۔" (دولی کلیمنٹ)

الف لیلہ اور دی کامیراں بوکاچیو وغیرہ داستانوں میں عورت کے مکر و فریب کے قصے مزے لے لے کر بیان کئے گئے ہیں اور عورت کی خوبیوں سے قطع نظر کی گئی ہے ۔ وارث شاہ نے بھی کہیں کہیں اس روایت کی ترجمانی کی ہے ۔ :

ع اعتبار ناہیں قول رن دے تے اوہناں اپیاں دی جنہاں جایاں نے

ع وارث رن، فقیر، تلوار، گھوڑا چارے تھوک کسے دے یار ناہیں

ع رناں سچیاں نوں کرن چا جھوٹھے رناں قید کراندیاں راہیاں نوں

ع جنہاں ڈبیاں پائیکے سِر پیچایاں رناں تنہاں دیاں مول نہ سکیاں نے

ع وارث ذات دی رن بے وفا ہندی پوری نال نہ کسے اتاریوں نی

سہ راتیں تُردیاں نے چھتی پتناں تے دِسنے بھولیاں لَل دُلیاں نے
دنے تارکاں نتردیاں بیبیاں نے سیجاں رات نوں مار تھتھلیاں نے
پچھے چرخڑا رُلے بے سُرن جوگا کدی چار نہ لاہیاں چھلیاں نے
رجھتے گبھرو ہون جا کھیں اوتھے پرہے مار کے بہن پتھلیاں نے

وارث شاہ کی سلامتیٔ طبع اور انصاف پسندی ملاحظہ ہو کر اُنھوں نے اس قدیم روایت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس سے انحراف بھی کیا ہے وہ عورتوں کی خوبیوں اور مردوں کی کوتاہیوں

کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جب رانجھا عورت کی بُرائی کرتا ہے تو سہتی اسے جواباً کہتی ہے کہ تو عورتوں کی بُرائی کرتا ہے۔ ہم مردوں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں جو راہِ راست سے بھٹک کر گمراہ ہو گئے ہیں۔ اپنی بیویوں سے دُور بھاگتے ہیں اور غیر عورتوں کو ورغلاتے رہتے ہیں۔ مرد حرص و ہوا کے بندے ہیں، اور ہر وقت حرام کاری پر کمربستہ رہتے ہیں۔ جس عورت کی مرد خبر تک نہ لے اور اس کے حقوق ادا نہ کرے تو اس کا گمراہ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس میں بھی قصور مرد ہی کا ہے۔ جو مرد خود غیر عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے اس کی اپنی بیوی کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ عورتوں کی بُرائی نہ کر ہم نے مردوں میں بھی دیوّث اور بھڑوے دیکھے ہیں۔ ؎

سہتی آکھدی رن نوں کریں بدوں اساں مرد بھی ڈھڑے بھالڑے ٹے
راہ رب رسول دا چھڈ جنہاں پھڑے آن اپُٹھڑے چپالڑے ٹے
رغبت حق حلال دے نال ناہیں کرن نویں توں نویں اُدھالڑے دے
گھریں راستی دی ناہیں گندھ پھولن کھولن باہر حرام دے نالڑے دے
غلبہ کام دا کُل ہے مرد تائیں جہڑے حکم دے کے رب پالڑے دے
بھلا دس کیکوں رن رہے ایویں جہدی سُرت نہ خصم سنبھالڑے دے
گھریں چوراں دے عورتی آن پوندے اہناں پوہ کدھر پا موگا لڑے دے
حق عورتاں دے سنداں ناہیں جھنڈو مرد بھی اپنی مُنہ کالڑے دے

مرد کے کردار کا یہ تجزیہ دنیائے ادب میں شاذ و نادر کہیں دکھائی دے گا۔ شیکسپیئر کی ایک ہیروئن کہتی ہے لے۔

"ڈائنا! ان مردوں کی قسموں، وعدوں، مکر و فریب، قول و قرار سے بچنا۔ یہ سب ہوا و ہوس کی علامتیں ہیں۔ ان چیزوں نے سیکڑوں دوشیزاؤں کو گمراہ کیا ہے۔"

اس ضمن میں ہیر اور رانجھے کا ایک مکالمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ ایک دن رانجھے نے طنزاً

لے All is Well That Ends Well

ہیر سے کہا کہ شریعت کی رُو سے عورت کا قول نامعتبر ہے۔ خدا نے قرآن میں بھی کہا ہے کہ عورت کا مکر بہت بڑا ہے۔ جن اور عورت کا مرشد شیطان ہے جو انھیں مکر و افترا کا سبق دیا کرتا ہے۔ عورتیں سچ کو بھی جھوٹ کر دکھاتی ہیں۔ عورتوں، لونڈوں، پوستیوں اور بھنگیوں کی بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے

شرع وچ منظور نہ قول رناں را نجھا ہیر نوں آکھ سنا وندا ای
مکر رناں دے جیڈ نہ مکر کوئی رب وچ قرآن فرما وندا ای
مرشد جن تے رن دا بجھ شیطان جیڑا افترا مکر پڑھا وندا ای
رناں سچیاں نوں کرن چا جھوٹے مرد آن دے وچ سما وندا ای
رناں منڈیاں پوستی بھنگیاں دا اعتبار نہ قول لیا وندا ای
وارث شاہ جے قول تے دین پہرہ بُت مہر دا چاک سدا وندا ای

ہیر جواب دیتی ہے کہ عورت کی برائی مت کرو۔ عورت تو چِتا پر جل مرتی ہے۔ مرد میں عورت جیسا حوصلہ کہاں۔ عورت تو عشق میں مال دولت املاک سب پر لات مار دیتی ہے۔ لیلیٰ قیس کے لئے رسوا اور خوار ہوئی۔ سوہنی محبوب کی خاطر دریا میں ڈوب مری۔ زلیخا نے پیار کی خاطر سرداری کو ٹھکرا دیا۔ عورت پیار میں میکہ، سسرال، عزیز اقارب چھوڑ دیتی ہے اور دولت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ سسی پنوں کی تلاش میں شہید ہوئی۔ شیریں نے صدق و صفا کا ثبوت دیا۔ جتنے بھی غوث اولیاء دنیا میں ہوئے ہیں سب عورت کی کوکھ ہی سے پیدا ہوئے تھے۔ حوا اور آدم میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا رتبہ ایک جیسا ہے۔ وارث شاہ بھی جانتا ہے کہ ضبط و حوصلہ عورت جیسا کسی میں نہیں ہو سکتا۔ ہے

ہیر آکھدی رناں نوں نند ناہیں رن چیہہ چڑھنی چتا جال دی اے
ہٹھ رن جیڈا مرد ناہیں کردا رن مال تے ملک نہ بھالدی اے
مجنوں یار پچھے لیلاں خوار ہوئی سوہنی اپنے آپ نوں گالدی اے

زلیخاں چھڈ سرداریاں ہوئی عاجز جھگی پا نہ جان سنبھالدی اے

پیکے ساہورے سکیاں نوں دیئے چھچا غمی کرے نہ دولتاں بالدی اے

سسّی ہو شہید وچ تھلاں ہوئی شیریں صدق یقین دکھالدی اے

ولی غوث سب رناں تھیں ہوئے پیدا حوّا سمجھ لے آدموں نالدی اے

ہٹھ رن دے جیڈ نہ کوئی کروا وارث شاہ نوں خبر ایس حالدی اے

ہیر خود بھی صبر و وفا کی پُتلی تھی۔ اس کی زباں سے عورت کا یہ دفاع مؤثر و مسکت ہے۔ یہ نظریہ نہایت متوازن ہے کہ آدم و حوّا کا مرتبہ ایک جیسا ہے۔ کلاسیکی شاعری اور ادب میں مرد و عورت کی برابری کا خیال کم ملے گا۔ اِسے وارث شاہ کا ذاتی اجتہاد سمجھنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر کر عورت خود فراموشی، ایثارِ نفس، قربانی اور ضبط و حوصلہ کا پیکر ہے۔ وارث شاہ نے عورت کی ایسی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو کم از کم عشق و محبت کے عالم میں بہت ہی کم مردوں کو ارزانی ہوتی ہیں۔ بائرن نے سچ کہا ہے کہ "عشق مرد کی زندگی کا محض ایک حصہ ہے لیکن عورت کی تو زندگی یہی ہے۔"

وارث شاہ پر تیسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اُنھوں نے ہندوؤں کی کتھائیں بہت لکھی ہیں۔ یہ اعتراض عدم تدبر پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ وارث شاہ جب ہیر رانجھے کا قصہ نظم کرنے بیٹھے تھے تو ان کا مقصد ہندوؤں کی کتھائیں لکھنا نہیں تھا۔ ہندوؤں کی روایات کا ذکر جہاں کہیں بھی آیا ہے ضمناً آیا ہے۔ یا تلمیحات کی صورت میں آیا ہے۔ جس زمانے میں ہیر لکھی گئی تھی ہندوؤں کے مذہبی خیالات اور صنمیاتی قصے پنجابی دیہات کے معاشرے میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ان کے ذکر سے قطع نظر کرنا از قبیلِ محال تھا۔ رانجھے کا جوگی بننے کا واقعہ اس قصے کا ایک اہم جُز ہے۔ جب تک وارث شاہ یوگ کے عقاید، آداب اور طور طریقوں سے کامل واقفیت بہم نہ پہنچا لیتے ان کے لئے اس واقعہ کے متعلقات سے انصاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ جیسا کہ ہم ان کی علمیت کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ انھیں کم از کم گیتا، وشنو

پران اور یوگ وششٹا پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اور انھوں نے یوگ کے بارے میں بصیرتِ تام حاصل کر کے قلم اٹھایا تھا۔ ان کے سوانح حیات پر گمنامی کے تاریک پردے پڑے ہیں۔ اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ علوم انھوں نے کہاں سے حاصل کئے تھے۔ بھگتی کی تحریک صوفیہ وجودیہ کے عقائد سے متاثر ہوئی تھی۔ اور مرورِ زمانہ سے ویدانت اور تصوّف کے خیالات آپس میں گھل مل گئے تھے۔ جیسا کہ بھگت کبیر اور گورو بابا نانک کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے۔ سمادھی اور مراقبے، پرانایام اور حبسِ دم، تجرد اور سنیاس، تسبیح اور مالا میں واضح مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ وارث شاہ نے ایک وجودی صوفی کی حیثیت سے یوگ اور ویدانت کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے وہ نہایت اعتماد سے اور پوری بصیرت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وارث شاہ کی یہ بصیرت اچنبھے کا باعث بھی نہیں حضرت میاں میر، ان کے مرید ملا شاہ بدخشی اور ملا شاہ بدخشی کے پیرو ملا محسن فانی کاشمیری صاحبِ دبستان المذاہب یوگ اور ویدانت کے دقائق و رموز سے بخوبی آشنا تھے۔ ان نظریات کا علم وارث شاہ کی ہمہ گیر فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ اس خوبی کو عیب قرار دینا زیادتی ہے۔

اعتراضات کا رد لکھنے سے ہمارا مقصد وارث شاہ کی طرف سے معذرت خواہی کرنا نہیں ہے نہ یہ ثابت کرنا ہے کہ 'ہیر' کوتاہیوں سے اور خامیوں سے پاک ہے۔ 'ہیر' میں بے شک خامیاں ہیں جیسے کہ دنیائے ادب و شعر کے تمام شاہکاروں میں بالعموم دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہمارے خیال میں وارث شاہ کی ایک خامی یہ ہے کہ چند ایک مقامات پر انھوں نے مقتضائے حال کو مجروح کیا ہے۔ مثلاً چوچک کے سامنے گاؤں کی جوان لڑکیاں جس پیرائے میں کیدو کی شکایت کرتی ہیں وہ بلاشبہ فحش بھی ہے اور مقتضائے حال کے منافی بھی۔ دیہاتی لڑکیاں ایسے واشگاف انداز میں اپنے بڑے بوڑھوں کے سامنے باتیں نہیں کیا کرتیں۔ ہیر اور قاضی کے مکالمے میں ہیر قرآن، فقہ اور حدیث سے بے تکلف حوالے دیتی ہے۔ اس کے استدلال کی عالمانہ روش سے یوں لگتا ہے جیسے کوئی جید عالم مناظرہ کر رہا ہے۔ ظاہراً یہاں وارث شاہ جوشِ نمود کی رو میں بے اختیار بہہ گئے ہیں۔ اور ہیر کی زبانی اپنے علمی تبحر کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی حال رانجھے اور سہتی کی تکرار کا ہے اس

میں بھی کہیں کہیں رانجھے اور سہتی کی زبانی دقیق علمی نکتے بیان کئے گئے ہیں. جس سے مقتضائے حال کی جراحت ہوئی ہے. ہیر، رانجھے اور سہتی سے علمی تبحر کی توقع نہیں کی جا سکتی. یہ مقامات اِس لئے بھی کھٹکتے ہیں کہ اکثر و بیشتر وارث شاہ نے مقتضائے حال کا خاص طور سے خیال رکھا ہے. جس نے ہیر کو حقیقت نگاری کا رنگ عطا کیا ہے. جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے، ہیر میں کہیں کہیں شُتر گُربگی اور ایطاء بھی دیکھنے میں آتے ہیں. لیکن یہ جزئی کوتاہیاں ہیں جو چنداں قابلِ لحاظ نہیں ہیں. اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس نوع کے اشعار الحاقی ہوں.

مقاماتِ وارث شاہ

نقدِ ادب کی معروف روایت ہے کہ کسی شاعر کا مقام معین کرنا ہو تو اس کا تقابلی موازنہ اس کے کسی ہمسر و ہم پایہ سے کرتے ہیں۔ مثلاً گوئٹے کا ذکر دانتے اور ورجل کا تذکرہ ہومر کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی کی غزل کا تجزیہ خواجو کی غزل کی نسبت سے کرتے ہیں۔ لیکن وارث شاہ اس قدر جامع حیثیات ہیں کہ نہ ان کا موازنہ کسی شاعر سے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہیر کو شاعری کی کسی روایت سے وابستہ کرنا ممکن ہے۔ اگر 'ہیر' محض ایک عشقیہ قصہ ہوتی تو ایسا کرنا سہل تھا۔ لیکن مشکل تو یہی ہے کہ 'ہیر' محض ایک عشقیہ قصہ بھی نہیں ہے۔ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب 'الاغانی' کو 'دیوان العرب' کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں عربی معاشرے کے تمام پہلو منعکس ہوئے ہیں۔ اس پہلو سے ہم 'ہیر وارث شاہ' کو 'دیوانِ پنجاب' کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دیس پنجاب کا معاشرہ پوری آب و تاب کے ساتھ متشکل ہوا ہے۔ لیکن یہ مماثلت اسی ایک پہلو تک محدود ہے کیونکہ کتاب الاغانی میں بیسیوں کہانیاں ہیں جبکہ 'ہیر' ایک مسلسل منظوم قصہ ہے۔ اصنافِ ادب میں مقامہ[1] (ایسی کہانی جس کا مرکزی کردار کوئی لاابالی مہم جو ہو) ایک ایسی صنف

---

[1] مقاماتِ حریری عربی ادبیات کا معروف شاہکار ہے۔ انگریزی ادب میں ناول کی وہ صنف جسے Picaresque کہتے ہیں، مقامہ ہی سے ماخوذ ہے۔

ہے جو ہیر وارث شاہ کے قریب تر ہے لیکن دقت یہ ہے کہ رانجھا محض ایک لاابالی مُہم جُو ہی نہیں ہے بلکہ عاشق صادق بھی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وارث شاہ کی شاعری کلاسیکی ہے، رومانوی ہے یا رمزیاتی ہے۔ بے شک ہیرؔ میں یہ ساری روایات کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں لیکن اس پر کسی ایک روایت کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ ہر نظم اپنی مستقل بالذات حیات رکھتی ہے۔ کافی بالذات 'کُل' ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ شاعر کے سوانح حیات یا شخصی واردات سے قطع نظر کر کے کرنا چاہیئے۔ یہی بات جونگ نے نفسیات کی زبان میں کہی ہے ہیر وارث شاہ کے مطالعے پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔ کیونکہ ایک تو ہم وارث شاہ کے سوانح حیات سے کماحقہ واقف نہیں ہیں۔ دوسرے جیسا کہ راقم التحریر نے ابھی کہا ہے 'ہیر' کو شاعری کی کسی روایت سے وابستہ کرنا مشکل ہے 'ہیر' کے کردار بھی بڑی حد تک منفرد ہیں۔ مثال کے طور پر ہیرؔ کے کردار کو لیجئے وہ فاؤسٹ کی مارگریٹ کی طرح مہر و وفا کی پُتلی ہے۔ لیکن اس کے احساسِ معصیت سے عاری ہے۔ طربیۂ خداوندی میں دانتےؔ نے بیاترچے کو ایک مقدس دیوی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جبکہ ہیرؔ ایک منچلی اُلھڑ دیہاتی لڑکی ہے۔ ورجلؔ کی اینڈ میں ملکہ دیدو اپنے محبوب اینیس کی بے وفائی پر اسے سخت لعن طعن کرتی ہے اور کہتی ہے کہ موت کے بعد بھی آسیب کی طرح تیرا پیچھا کرتی رہوں گی جبکہ ہیرؔ رانجھے کی بے جا طنز و تعریض کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے۔ کالیداس کی شکنتلا باوفا ہے لیکن ہیرؔ کی شگفتگیٔ طبع سے عاری ہے۔ وہ بھولی بھالی عورت ہے جبکہ ہیرؔ پنجاب کے دیہات کی ایک بگڑی ہوئی شریر مٹیار ہے جس کے کردار کو خلوص و محبت نے رفعت بخشی ہے۔ غزل الغزلات کی حسینہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب سے روز خوابی کے عالم میں باتیں کرتی ہے اور گذرے ہوئے ایام کو یاد کر کے آہیں بھرتی ہے۔ ہیرؔ بھی دردِ فراق کا بے محابا اظہار کرتی ہے لیکن اس کی ہوشمندی اور فہم سلیم میں فرق نہیں آتا، وہ اپنے محبوب سے ملاقات کی تدبیر کرتی ہے اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اُس کے

رومان میں حقیقت پسندی، جنوں میں ہوشمندی اور شیفتگی میں آگہی کا عنصر موجود ہے۔ راقم کے خیال میں ہیروارث شاہ سے دنیائے شاعری میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا تھا جسے سوویٹ روس کے معاصر ناقدینِ ادب کی زبان میں "رومانوی حقیقت پسندی"[1] کا نام دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت پسندی کا آغاز ادبیاتِ مغرب میں ناول سے ہوا تھا۔ یہ رجحان جاگیرداروں کے اقتدار کے خاتمے اور عوامی معاشرے کی تصویر کشی سے وابستہ ہے۔ ڈکنز، بالزاک، اور گوگل کے ناولوں میں یہ عظیم روایت سرسبز ہوئی اور زولا کے ناولوں اور ہاپٹ مان کی تمثیلوں میں فطرت پسندی[2] کی انتہا کو پہنچ گئی۔ ۱۹ویں صدی عیسوی میں جاگیرداروں کی جگہ تجارت پیشہ، صنعتکار اور ساہوکار برسرِاقتدار آ گئے اور کلوں کی ایجاد نے مغربی سامراج کے لئے راستہ ہموار کیا۔ اسی صدی کے اواخر میں سرمایہ دارانہ نظام اور سامراج کے خلاف اشتراکیت کی تحریک شروع ہوئی۔ سرمائے اور محنت کی کشمکش میں ذی شعور انسان دوست اُدبا اور شعراء نے عوامی اُمنگوں اور وَلوَلوں کی ترجمانی کی۔ جس سے حقیقت پسندی میں ترقی پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔

صنعتی انقلاب اور اشتراکیت کی اشاعت و فروغ کے ساتھ ایک نیا مزاجِ عصر صورت پذیر ہوا ہے جو بدلتے ہوئے سماج کی نئی انقلابی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ ترقی پسند شاعر اور ادیب اسی مزاجِ عصر کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ وہ سرمایہ داروں اور سامراجیوں کے آہنی شکنجے میں کسے ہوئے محنت کشوں کی مظلومیت سے روح کی گہرائیوں تک متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ انھیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں نوعِ انسان کے مقدر کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں آنے والی ہے۔ یہی جذبہ اور یہی تخیئل ترقی پسندوں کے شعر و ادب میں کارفرما ہے اور انھوں نے پوری خود سپردگی کے ساتھ اپنے آپ کو عوامی تحریکوں کے ساتھ وابستہ کر لیا ہے۔ دوسری طرف رومانی، رمزیاتی اور اظہاریتی روایات بودلیئر، راں بو، دی انتزیو، پیراں دیلو، کافکا اور رِلکے میں زوال پذیر ہو گئیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نئے نئے سیاسی اور عمرانی تقاضوں کی حرارت کو محسوس نہیں کیا۔ جن کا ذوقی و قلبی

---

[1] Romantic Realism

[2] Naturalism

نے مزاج عصر سے قائم نہ ہو سکا جو سرمایہ دارانہ نظام کے مخدوش حال اور تاریک مستقبل سے خائف ہو کر اپنی اپنی انا کی بند کوٹھڑیوں میں پناہ گزین ہوئے۔ ترقی پسند اُدبا اور شعراء نے حقیقی معاشرے کی نئی قدروں اور نئے نصب العینوں سے اپنا تخلیقی رشتہ استوار کیا اور ادب و شعر کو زوال پذیری کے دلدل سے نکال کر اسے نئے سرے سے تپش حیات عطا کی۔ جیسا کہ ہم گذشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں وارث شاہ کے یہاں بھی جاگیردارانہ معاشرے کے زوال کا گہرا شعور موجود ہے۔ اُنھوں نے ستم رسیدہ عوام کی مظلومیت کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ آج سے کم و بیش دو سو سال پہلے کے جاگیردارانہ نظام میں ان حقائق کا شعور و ادراک بلاشبہ وارث شاہ کی دیدہ وری کی بیّن دلیل ہے۔ فلسفۂ یونان میں ظالموں کو جان سے مار دینا ایک مستحسن فعل ہے۔ وارث شاہ کی اخلاقیات کا بھی یہ ایک اہم اصول ہے۔ فرماتے ہیں۔

گ وارث شاہ جے مارئیے بداں تائیں تہاں خون نہ دیونے آوندے نے۔

(جو 'بدوں' کو جان سے ماردیں اُن پر قصاص واجب نہیں ہوتا)

'داری، خودشعوری اور کشفِ ذات کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گ تینوں رب شہباز بنایا سی بنیوں کرتاں نال توں اِل آپے

(خدا نے تجھے شہباز بنایا تھا اپنے کرتوتوں سے تو چیل بن گیا ہے)

اخلاقیات کے یہ اصول ہمیں اخلاقِ جلالی یا اخلاقِ ناصری میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ ان کتابوں میں فروتنی، عاجزی اور سکنت کی تعلیم دی گئی ہے۔ 'بدوں' کے خلاف بغاوت کی تلقین کرنا اور عوام کو اپنی شہبازی کا احساس دلانا وارث شاہ کے انقلابی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔

مسلمان شمالی ہند میں وارد ہوئے تو ان کی زبان فارسی تھی۔ تُرک سلاطین بھی گھروں میں ترکی بولتے تھے اور دربار میں فارسی میں بات چیت کرتے تھے۔ محمود غزنوی اور جلال الدین اکبر کے دور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور عسکری غلبے کے زمانے تھے۔ اس لئے فرخی عنصری، عسجدی، فیضی اور عرفی کی شاعری میں ایک خوش آئند حیات پرور طنطنے کا احساس

ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کو زوال آگیا۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے چاروں طرف شورش برپا کردی۔ اس زوال پذیر معاشرے کا عکس معاصر فارسی شعراء کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ 'اسلوبِ ہندی' کا ابتدائی دور اظہار و بیان کی شگفتگی کا آئینہ دار تھا مرورِ زمانہ سے خلوصِ بیان کی جگہ دور از کار استعاروں اور نام نہاد 'خیال بندی' نے رواج پایا اور فارسی غزل سے شعریت کی روح غائب ہوگئی۔ فارسی شاعری کے اس تنزل کے ساتھ اردو شاعری کا آغاز وابستہ ہے۔ چنانچہ اردو غزل فارسی غزل ہی کا چربہ تھی۔ اس کے اسالیبِ بیان، تشبیہات، استعارے، تلمیحات اور محاورے فارسی ہی سے مستعار تھے اس لئے دراصل اردو شاعری شروع ہی سے زوال پذیری کا شکار ہوگئی۔ تین شعراء البتہ اس زوال پذیری سے محفوظ رہے۔ سودا، غالب، نظیر اکبر آبادی۔ غالب اور سودا اس لئے کہ ان کے آباء کو ہندوستان میں وارد ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لئے وہ زوال پذیری کی کان نمک میں نمک نہیں ہو پائے تھے۔ اسی لئے ان کے کلام میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی مرد قلندر تھے لہذا زوال پذیر درباری معاشرے سے ان کا ذہنی و ذوقی رشتہ قائم نہ ہوسکا۔

زوال پذیری کے ساتھ اردو شاعری میں مریضانہ دروں بینی اور سقیم داخلیت و فردیت ممزوج ہوگئی۔ فارسی کے شاعروں کی تقلید میں امردوں اور کسبیوں کو مثالی محبوب کا درجہ دیا گیا۔ فارسی کی تلمیحات، محاورے اور اسالیبِ بیان من و عن اخذ کئے گئے جس سے اردو شاعری میں مقامی رنگ پیدا نہ ہوسکا۔ نہ اس کی جڑیں ہند و پاک مٹی میں پیوست ہوسکیں۔ پشتو، سندھی، بروہی اور پنجابی کے شعراء دار السلطنت دہلی اور لکھنؤ سے دور ہونے کے باعث فارسی شاعری کے زوال پذیر اثرات سے محفوظ رہے۔ ان کے یہاں بھی کہیں کہیں جام جمشید، شیریں فرہاد وغیرہ کا ذکر آتا ہے لیکن ذوقی فیضان وہ گرد و پیش کے طبعی و تہذیبی ماحول ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی سبب ان کی شاعری میں اپنے اپنے علاقے کے لوک بت کماؤ کا رس اور لوک گیتوں کی شیرینی رچ بس گئی ہے۔ اسی بات میں رحمان بابا، شاہ لطیف بھٹائی، خواجہ غلام فرید اور وارث شاہ

کے کلام کی بے پناہ کشش کا راز مخفی ہے۔

فارسی کے کئی شاعروں نے ہیر رانجھے کا قصہ نظم کیا ہے۔ سعید سعیدی کی مثنوی افسانۂ دلپذیر لائق کی ہیر رانجھا، فقیر اللہ آفریں کی قصۂ ہیر رانجھا، احمد یار خاں یکتا کی داستانِ ہیر رانجھا، میر قمرالدین منت کی مثنوی قصۂ ہیرو رانجھا، آرام کی مثنوی ہیرو رانجھا اور باقی کولابی کی مثنوی ہیر رانجھا قابلِ ذکر ہیں، لیکن اسالیب، تشبیہات اور تلمیحات کے لحاظ سے ان مثنویوں میں اور نظامی گنجوی ملا جامی یا امیر خسرو کی مثنویوں میں کچھ بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں معاصرت کے اس شعور کا فقدان ہے جس کی اہمیت گوئٹے نے یہ کہہ کر واضح کی تھی کہ

> ہر معاصر ادیب کو یہ بات معلوم کرنا ہوگی کہ اس کے معاصرین کی داخلی حسِ زمان کیا ہے
> ایک ادیب یا ایک مصور اس شے کا زیادہ واضح شعور رکھتا ہے۔ ادیب کا کام ہی اس
> معاصرت میں زندگی گذارنا ہے۔"

وارث شاہ کو معاصرت کا شعورِ کامل ارزانی ہوا تھا۔ ہم گذشتہ اوراق میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکے ہیں۔ مزید وضاحت کے لئے ہم باقی کولابی اور ہیر وارث شاہ سے دو تقابلی اقتباسات دیں گے۔ باقی ہیر کے حسن و جمال کی تعریف میں کہتا ہے۔

ہیر آں صنمی سمن عذارے	کو راست بہر طرف ہزارے
بودہ گلِ گلشنِ جوانی	نو رستہ نہالِ زندگانی
سرتا قدمش چو آبِ حیواں	کو داد بصد ہزار کس جاں
حیراں بجمالِ او جہانے	ہر گوشہ درہاست ناتوانے
آشفتہ موی او ہزاراں	دل خستہ روی او ہزاراں
از سنبلِ او بنفشہ در تاب	گشتہ دلِ صد ہزار بے تاب
از چشم سیاہ پُرفنِ او	وز طرزِ نگاہ کردنِ او

برخاستہ چشم فتنہ از خواب — بیدار شدہ فتاد بے تاب

نرگس شدہ بے قرار و بیمار — از پای فتادہ رفتہ از کار

از فتنہ گری آں دو جادو — برخاستہ فتنہ ای ز ہر سو

آتش زدہ روی او جہاں را — خوں کرد دل بس عاشقاں را

در حسرت آں دو لعل خنداں — خوں بستہ دل چو من ہزاراں

خوں بستہ دلی بسے ازاں لب — شد خستہ دل بسے ازاں لب

زاں پستہ دہاں شکریں لب — خوں بستہ دل ہزار یا رب

سرخیل پری وشاں بود ہیر — ہستی جہاں جاں بود ہیر

ان اشعار میں گھسے پٹے استعاروں اور اسالیب کی بھرمار ہے جس سے قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ باقی کولابی کس ملک و قوم کی عورت کا سراپا لکھ رہا ہے۔ یہی سراپا شیریں، عذرا، لیلیٰ زلیخا کا بھی ہو سکتا ہے۔ وارث شاہ ہیر کے حسن و جمال کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں۔ ۵

دند چنبے دی کلی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں

لکھی چین تصویر کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں

گردن کونج دی انگلیاں روانہہ پھلیاں ہتھ کوولے برگ چنار وچوں

چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری پٹ کھینوں سیب بلخ دے چنے انبار وچوں

دھنی بہشت دے حوض دا مشک قبہ پیڈو مخملی خاص سرکار وچوں

کافور شہناں سرین بانکے حسن ساق ستون مینار وچوں

سرخی ہونٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا خوجے کھتری قتل بازار وچوں

باہاں ویلنے ویلیاں گنھ مکھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں

شاہ پری دی بھین پنج پھول رانی گجھی رہے نہ ہیر ہزار وچوں

سہیلیاں نال لٹکدی ان متی جویں ہرنیاں ترٹھیاں بار وچوں

لنک باغ دی پری کہ اندر رانی حور نکلی چند انوار وچوں
پُتلی پیکنے دی نقش رُوم والے لدھا پری نے چند پروار وچوں

ان اشعار میں پنج پھول رانی، لنک باغ دی پری (سیتا) اندرانی (اندر کی زوجہ)، مُلکی تلمیحات ہیں۔ دند چنبے دی کلی، کشمیر تصویر جٹی، گردن کونج دی انگلیاں روانہ پھلیاں، چھاتی پٹ کھینوں (ریشم کی گیندیں) سرخی ہوٹھاں دی لہر دندا مڑے دا، ٹھوڈی کھتری قتل بازار وچوں، ڈاہاں ویلنے ویلیاں گنڈھ مکھن، چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں، جویں ہرنیاں ترٹھاں بار وچوں جیسی تمثیلیں اور تشبیہات گردوپیش سے لی گئی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیر اسی ملک کی ایک خوبصورت مٹیار ہے۔

پنجابی اور اردو میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ اردو کے کسی شاعر نے ہیر رانجھے کی عشقیہ داستان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ اس سے بخوبی واقف تھے[1]۔ اردو کے شاعر اور قصہ نویس ہندوستان میں بیٹھ کر شام، عرب، مصر، ایران، چین، فرنگ کی داستانیں لکھتے رہے لیکن پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کی ولولہ انگیز عشقیہ کہانیوں کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ ایک صاحب مقبول احمد گوپاموئی نے البتہ اردو نثر میں یہ قصہ لکھا تھا۔ اس میں فرماتے ہیں:

افسانۂ ہیر رانجھا سرزمین ہند میں عجیب دلچسپ نمکین و رنگین طرفہ صداقت آمیز و خلوص آگین واقع ہوا ہے۔ ہر چند نفیر پُر تقصیر کو ایسے مقدمات کے قلم بند کرنے سے سروکار نہ تھا بلکہ ننگ و عار تھا مگر بعض آشنایانِ صدق و وفاق نے تکلیف مالایطاق دی۔ خیال نظم فارسی نے دل میں جا کی۔ کچھ اشعار لکھے پھر دھیان آیا کہ فی زمانہ رواج اردو کا بیشتر ہے اور نظم سے نثر وسعت اثر۔ اکثر حاصل مطلب خلاصہ مقصد حشو زوائد مقفیٰ و مسجع جلی بطرزِ نو بطرز مرصع

---

[1] انشاء اللہ خاں انشا:

کہانی ایک سنائی یوں ہیر رانجھا کی   تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا۔

بپاس خاطر احباب مخلص تحریر کیا۔"

مقام غور ہے کہ جب موہا گوئی کے بقول افسانہ ہیر رانجھا " طرفہ صداقت آئین و خلوص آگین واقع ہوا ہے" تو اسے لکھنے میں انھیں ننگ و عار کیوں محسوس ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں آج بھی ایسے برخود غلط گوپا مونیوں کی کمی نہیں ہے جو تہذیب و شائستگی کی اجارہ داری کے زعم بے جا میں علاقائی زبانوں کے شعر و ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

وارث شاہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہیر کے اوراق میں دیس پنجاب کے معاصر معاشرے کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ اس پہلو سے شعر و ادب کو تاریخ پر برتری حاصل ہے کہ تاریخ محض ایک بے جان خاکہ ہوتا ہے جس میں رنگ شاعری اور قصوں سے بھرا جاتا ہے۔ ہمارے شاہیت کے دور کے مورخین سلاطین و امراء کے سوانح اور ان کے جنگ و جدال کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں عوام گویا ان کے لئے کبھی تھے ہی نہیں۔ چنانچہ ہمیں فرشتہ، خافی خاں بدایونی وغیرہ کی تاریخوں میں انہی لوگوں کے نام یا کام کا ذکر ملے گا جو سلاطین و امراء کے درباریوں اور محلوں سے وابستہ تھے۔ ان کے یہاں سلاطین و امراء کے خواجہ سراؤں، لونڈیوں، اصیلوں، امردوں، فلاقتیوں، کسبیوں، فیل بانوں وغیرہ کے حالات مل جائیں گے لیکن ہم کبھی یہ معلوم نہیں کر پائیں گے کہ اس دور کے عوام کیسے گذر بسر کرتے تھے۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں سے ان کے روزمرہ کے معمولات کیسے متاثر ہوتے تھے۔ قحط اور وبا میں ان کا کیا حشر ہوتا تھا۔ سلاطین کی عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے عوام پر جو بھاری محصول لگائے جاتے تھے وہ ان کے متحمل کیسے ہوتے تھے۔ شاہی کارندوں کی خوشنودی کے لئے اور ان کی تعدی سے بچنے کے لئے انھیں کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔ بددیانت اور قابوچی حکام کس بے دردی سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی نذرانوں کی صورت میں ہڑپ کر جاتے تھے۔ زمیندار اور جاگیردار کسانوں کو کس طرح جبر و ستم کا نشانہ بناتے تھے۔ اور کس طرح ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت غارت کرتے تھے۔ مکار پیر اور ریاکار ملا کس طرح عوام کو غچے دے کر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ عوام سلاطین کے استبداد

سے خائف تھے یا اُن کے سینوں میں بغاوت کے جذبات بھی کر دٹیں لیتے تھے۔ درباری مورخین ان امور کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان کی واقعہ نگاری دہلی، آگرہ، لکھنؤ جیسے درباری شہروں کے گرد گھومتی ہے۔ دیہاتی معاشرے کی جھلک شاذ و نادر ہی ان کے اوراق میں دکھائی دے گی۔

ہیر کے مطالعے سے وارث شاہ کے زمانے کا پنجابی معاشرہ پوری طرح متشکل ہو کر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ارسطو نے کہا تھا کہ آرٹ نیچر کی خامیوں کی تلافی کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں شعر و ادب تاریخ نگاری کے خاکے میں رنگ بھرتے ہیں۔ کم از کم وارث شاہ نے معاصر پنجابی معاشرے کی تصویر کشی کر کے اس عہد کے مورخین کی کوتاہیوں کی بوجہ احسن تلافی کر دی ہے

ہمارے زمانے میں صنعتی انقلاب کے باعث سماجی اور طبقاتی سانچہ بدلتا جا رہا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں ترقی پسند شعراء اور ادباء جمالیاتی تقاضوں کی تشفی کے ساتھ ساتھ نقد و ابلاغ کا فرض بھی ادا کر رہے ہیں اور انقلاب پسندوں کے دوش بدوش عوامی تحریکوں کو تقویت دے رہے ہیں۔ فن کار، شاعر اور ادیب کے اس منصب کی جانب سب سے پہلے بیلنسکی اور لیو ٹالسٹائی نے توجہ دلائی تھی۔ لیو ٹالسٹائی شیکسپیئر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "شیکسپیئر کی تمثیلوں کا موضوع زندگی کا نہایت سوقیانہ اور پست نقطۂ نظر ہے جس کی رُو سے امراء اور روساء کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شیکسپیئر محنت کشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کوشش میں مانع ہے کہ مذہب یا انسان دوستی کی بنیاد پر معاشرے کے موجودہ نظام کو بدل دیا جائے۔"
>
> (آرٹ کیا ہے؟)

شیکسپیئر سے متعلق یہ رائے انتہا پسندانہ ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ رائے دُنیا کے عظیم ترین ناول نگار کی ہے۔ جو ہر لحاظ سے شیکسپیئر کا ہم پایہ ہے۔ ٹالسٹائی شیکسپیئر کے حوالے سے اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام معاشرہ کے فن کار اور اُدباء عوامی آزادی کی انقلابی تحریکوں کی آبیاری سے قاصر رہے ہیں۔ ٹالسٹائی نے شیکسپیئر کو انقلابی تصور کے

اس معیار پر جانچا تو اسے کم عیار پایا۔ ٹالسٹائی نے ادیب اور فن کار کے جس انقلابی فرض کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آج زیادہ شدت کے ساتھ مشرقی اُدبا و شعرا پر عائد ہوتا ہے۔ اس پہلو سے وارث شاہ کی عوامی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو مفہوم ہوتا ہے کہ وارث شاہ کا کلام ان معاصر شاعروں کے کلام سے زیادہ ترقی پرور ہے جو مغرب کی زوال پذیر فنی و ادبی تحریکوں سے ذوقی فیضان حاصل کرتے ہیں اور موجودیت (Existentialism) ماوراء واقعیت (Surrealism) لایعنیت (Absurdism) لمعبیت (Cubism) لاحاصلیت (Futilitarianism) دادا (Dada) کے نام سے مغرب کی سقیم و روں بینی اور کھوکھلی بے جان قدروں کا پیوند مشرق کے از سرِ نو ابھرتے ہوئے ترقی پذیر معاشرے اور ادب و فن پر لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

روسی ناول نگاروں گوگل، ترگینیف، دوستوفسکی، ٹالسٹائی وغیرہ پر نقد لکھتے وقت کہا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں میں "روسی روح" پوری طرح منکشف ہوئی ہے۔ یعنی ان میں روسیوں کے اتھاہ غم و الم اور حزن و ملال کا امتزاج اعلیٰ نصب العینوں کی جستجو کے ساتھ ہوا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ دانتے کے "طربیۂ خداوندی" میں "اطالوی روح" اپنی تقدس آمیز جمالیت اور گوئٹے کی "فاوسٹ" میں جرمن روح اپنی ہمہ گیر آفاقیت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔ ہیر وارث شاہ میں پنجابیوں کی شہامت، وسعتِ قلب، جوانمردی، زندہ دلی اور دردمندی کا امتزاج عاشقانہ وارفتگی اور رفعت پسندی کے ساتھ ایسے نادر پیرائے میں ہوا ہے کہ دنیائے شعر و شاعری کے چند گنے چنے شاہکار ہی ہیر کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ قرائن و آثار بتا رہے ہیں کہ عنقریب پنجابی زبان کو اس کا کھویا ہوا مقام مل جائے گا۔ جب دیس پنجاب کے شاعر اپنے عظیم اور جیالے عوام کی آرزوؤں، حسرتوں اور ولولوں کی ترجمانی پر نئے سرے سے کمربستہ ہوں گے تو ہیر وارث شاہ ان کے لئے مسلسل ذوقی و لسانی فیضان کا سرچشمہ بن جائے گی۔ ایک

وقت ایسا بھی آئے گا جب وارث شاہ کو شعرائے عالم کی صف میں وہ مقام رفیع ارزانی ہو گا جس کے وہ بدرجہ اولیٰ مستحق ہیں اور جس سے ان کی محرومی پورے عالمی ادب کی محرومی بن گئی ہے۔